لہٗ دعوۃ الحق

قرآن وسنت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ **الحق** اکوڑہ خٹک

جلد نمبر ۳ شمارہ نمبر ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ - اگست ۱۹۶۸ء

مدیر
سمیع الحق

اس شمارے میں

بدل اشتراک

مغربی پاکستان :- سالانہ چھ روپے ۔ فی پرچہ ۵۶ پیسے

مشرقی پاکستان :- سالانہ بذریعہ ہوائی ڈاک آٹھ روپے ۔ فی پرچہ ۶۲ پیسے ۔

غیر ممالک سالانہ ایک پونڈ ۔

سمیع الحق استاذ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک طابع وناشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ آغاز

اسلام میں قرآن کریم کے بعد دوسرا مقام سنت اور حدیث نبوی کا ہے۔ قرآن کریم اوّل تا آخر سنت نبوی کی اس اہم ترین مرکزی اور بنیادی حیثیت پر زور دیتا ہے۔ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو ایک ایسے رسول کی حیثیت سے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، جو بیک وقت معلّم اور مربّی بھی ہیں، شارحِ کتاب اللہ بھی اور تمام امت کے لئے پیشوا اور نمونۂ تقلید بھی۔ وہ رسول کی اتباع اور اطاعت کو محبتِ خداوندی اور یومِ آخرت کی امیدواری کی علامت قرار دیتا ہے، اور حضورؐ کی زندگی اور آپ کے اقوال و افعال کو اپنا اسوۂ حسنہ نہ بنانے والوں کو کافرین کے زمرہ میں شمار کراتا ہے۔ اسکی بیشمار آیتیں ناطق ہیں۔ کہ رسول کا کام صرف "کتاب" پہنچانا نہیں بلکہ اسکی تشریح و تعبیر اور اسکی تفسیر و تبیین بھی آپ کے فریضۂ نبوت میں شامل اور منصبِ رسالت کا تقاضا ہے۔ وہ جگہ جگہ رسول کو بحیثیت شارع پیش کرکے انہیں تشریعی اختیارات (LEGISLATIVE POWERS) دیتا ہے اور کبھی مختلف پیرایوں میں تصریح کرتا ہے کہ رسول کریم اللہ کے مقرر کئے ہوئے حاکم، فرمانروا اور قاضی (جج) ہیں ــ وہ خدائے بزرگ و برتر کی قسم کھا کر اعلان کرتا ہے کہ تیرے رب کی قسم جب تک یہ لوگ دل و جان سے تیرے فیصلوں کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کردیں یہ ہرگز ہرگز مؤمن نہیں ہو سکتے۔ تیری مرضی اور فیصلہ سے انکار تو کیا، اگر انہیں اپنے دلوں میں ذرا سی تنگی بھی محسوس ہو جائے تو یہ چیز متاعِ ایمان کے ضیاع اور دین و اسلام کی بربادی کا سبب ہوگی۔ مومنین کا شیوہ تو یہ ہے کہ جب اللہ اور رسول کی کسی بات اور فیصلہ کیطرف بلائے جائیں تو وہ دوڑتے چلے آئیں۔ اور کہیں کہ ہم نے سن لیا اور ہم نے مان لیا۔ (النور۔ ۵۱) رہے کفار اور منافقین، تو ان کا حال یہ ہے کہ ایسے موقع پر رسول سے کنی کتراتے ہیں۔ (النساء۔ ۶) وہی قرآن جسکی آڑ لیکر آج دین اور ملتِ اسلامیہ پر شبخون کرنیوالے یلغار کر رہے ہیں، اُسی کتابِ مبین کا اعلان ہے کہ رسوؐل کی اطاعت خدا کی اطاعت اور اس کے تشریعی منصب سے انکار خدا اور اسکی کتاب سے انکار ہے۔ وہی کتاب کہتی ہے کہ رسوؐل کی زبان خدا کی زبان۔ اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ اس کا قول خدا کی وحی اس کا عمل خدا کا منشاء اور اس کا فیصلہ خدائے بزرگ و برتر کا اٹل قانون ہوتا ہے۔

پھر آہ! ان لوگوں کی نفسانی خباثتوں اور فطری کج فہمیوں کا ماتم کن الفاظ سے کیا جائے جو

قرآن کا نام لیکر رسولؐ اولین و آخرین سے یہ سارے مناصب (خاکم بدہن) چھین لینا چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہے کتاب اللہ میں ہے، رسولؐ کی اپنی حیثیت کچھ بھی نہیں، نہ اس کے ارشادات اور تشریحات قرآن کو شریعت کا حصہ قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ انہیں مسلمانوں کے قانون کا ماخذ سمجھا جاسکتا ہے؟ حالانکہ سنت کا دوسرا ماخذ قانون (SOURCE OF LAW) ہونے پر صحابہ کرام سے لیکر آج تک امت مسلمہ کا اجماع چلا آرہا ہے۔ مگر اسلام میں سنت کو جتنا اہم کردار اور اساسی حیثیت دی گئی ہے، اسلام اور رسولِ اسلام کی ذاتِ اقدسؐ سے عناد رکھنے والے منافقین اور ملحدین نے سنت کی تشریعی حیثیت گھٹانے میں اتنا ہی زور لگایا ہے کہ جب رسولؐ کی تشریح اور تفسیر کو قرآن کریم کے احکام اور اصطلاحات سے الگ کر دیا جائے گا، تو اسلام اور قرآن کی من مانی تاویل بلکہ تحریف کے لئے راستہ کھل جائے گا۔ قرامطہ، باطنیہ، معتزلہ، خوارج اور اسطرح کے بیشمار فرق باطلہ میں یہ چیز آپ کو قدر مشترک کے طور پر ملے گی، خواہ یہ لوگ دعویٰ حدیث پر عمل کرنے کا کرتے رہے یا علانیہ انکار۔

پچھلی دو صدیوں سے یورپ کے مستشرقین اور مسلمانوں کے تجدد زدہ طبقوں کے مساعی کا محور بھی زیادہ تر "سنت رسول" ہی رہا کبھی کھلے الفاظ میں اسے نشانۂ تحقیق بنایا گیا اور کبھی منافقانہ لبادہ اوڑھ کر سنت کی نئی نئی تعبیرات کرنے کی شکل میں ہمارے ہاں کے تجدد زدہ حضرات جو نہ تو اپنی علمی و فکری قوتوں کو خدا و رسولؐ کی مرضیات پر چھوڑ دینا چاہتے ہیں اور نہ مجبوری اور مصلحتوں کی وجہ سے واضح طور پر اسلام اور ایمان سے انکار کر سکتے ہیں۔ ان کے مساعی کا تعلق بھی زیادہ تر سنت رسولؐ کی تشریعی حیثیت کو نقصان پہنچانے سے ہے۔ ایسے لوگ جن کی ساری علمی متاع اپنے پیشرو غیر مسلم مغربی اساتذہ کی تحقیق و ریسرچ ہے، ہمیشہ سنت نبوی کے مصداق پھر اسکی اہمیت اور استنادی حیثیت کو مجروح اور مشکوک کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے غلام احمد پرویز اور اسکی جماعت تو کھلے بندوں احادیث رسولؐ سے انکار کی دعوت دیتی ہے۔ اور کچھ لوگ علانیہ انکار کئے بغیر سنت اور حدیث کو اپنی ملحدانہ اغراض کی بناء پر ایسے معانی پہنانا چاہتے ہیں جس سے سنت کی حقیقت تو مسخ ہو کر رہ جائے، مگر انکار حدیث کے الزام سے بھی ان کا دامن بچ جائے۔ اس "طرز تحقیق" کا سہرا رسوائے عالم یہودی مستشرق پروفیسر جوزف شاخت کے سر پر ہے۔ اور ہمارے ہاں اس نظریہ کے فروغ و اشاعت کا فریضہ ان کے وفا شعار شاگرد ڈاکٹر فضل الرحمان اور ان کی ہمنوا جماعت بجا لا رہی ہے۔ پہلی جماعت اپنی فاسد اغراض اور خواہشات

کی راہ میں سنت رسول کو سنگ گراں سمجھ کر اسے راستہ ہی سے ہٹا دینا چاہتی ہے۔ مگر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا نظریہ "سنت جاریہ وغیر جاریہ" وہ عیارانہ حربہ ہے جسے ہاتھ میں لیکر آپ ہر قسم کی رندی اور عیاری پر تقویٰ اور پارسائی کا غلاف چڑھا سکیں گے۔ اس نظریہ کا خلاصہ فضل الرحمان صاحب کے الفاظ ہی میں یہ ہے کہ "سنت درحقیقت ایک تعامل اصطلاح" ہے۔ جسکی تشکیل "آزاد شخصی رائے" سے ہوتی ہے۔ اور "عوام الناس" یا "رائے عامہ" کے قبول کر لینے کے بعد وہی چیز "سنت" بن جاتی ہے اور رائے عامہ کے اس قبول کر لینے کا نام ہی "اجماع" ہے۔ جسکو وہ "آزاد اجماع" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق امت مجموعی طور پر سنت نبویؐ کے مشمولات کی تخلیق کرنے کی مستحق ہے۔ ملت الفاظ پر زور نہیں دیتی بلکہ اسکی روح کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔[1] اور اس "تعاملی اصطلاح کو جاری رکھنے کے لئے ڈاکٹر صاحب موصوف اس کا نام سنت جاریہ (زندہ سنت) رکھتے ہیں اور حضورؐ کی اصلی سنت کو سنت غیر جاریہ (مردہ سنت۔ معاذ اللہ) قرار دیتے ہیں۔ جسکی تشریح مختصراً یہ ہے کہ کتاب و سنت اور تعلیمات شریعت میں اتنی "توسیع" کر دی جائے کہ جدید تہذیب و تمدن کے پیدا کردہ تمام مسائل اور خرابیاں عامۃ الناس کی رائے اور تعامل کی وجہ سے حسب خواہش سنت اور شریعت میں سمائے جا سکیں۔

تحریف و تلبیس اور دین کی بنیادوں میں رخنہ اندازی کے لحاظ سے چودھویں صدی کی یہ تحقیق منکرین حدیث کے پہلے گروہ سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہے، تعجب ہے کہ بعض سادہ لوح حضرات کی نظریں لاعلمی یا دینی بے حمیتی کی وجہ سے فضل الرحمان کی اس تکنیک پر نہیں جاتیں اور وہ "انکار حدیث" سے دوسری جماعت کی برأت کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ فضل الرحمان یا اس کے ادارہ کیطرف سے اگر "پرویزی نظریہ" کے تعاقب میں کوئی مضمون آتا ہے تو وہ صرف اس وجہ سے کہ انہیں پرویزی انداز فکر مسلمانوں کے دینی احساسات اور جذبات کی وجہ سے اسلام کے حق میں کم خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ جبکہ یہ لوگ قصر اسلام کو خاکم بدہن جلد از جلد پیوند خاک دیکھنا چاہتے ہیں (ولا فخزیہ اللہ کذلک) یہ لوگ اپنے مقصد کے لئے چور اور منافق بن کر درپردہ حیلوں سے اس قصر میں نقب زنی کو زیادہ مؤثر اور مفید سمجھتے ہیں۔ پرویز جیسا جارحانہ اور دوٹوک طریقہ نہیں۔ اگر پرویزی جماعت کھلے ارتداد اور کفر صریح کا راستہ چھوڑ کر ان کی

---

[1] مذکورہ بالا نظریہ کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیے ماہنامہ فکر و نظر جولائی، اگست ۱۹۶۳ء مقالہ تصور سنت اور دیگر مضامین۔

طرح نفاق اور تلبیس کا راستہ اختیار کرے تو آج ہی یہ دونوں مکتبِ فکر گلے مل سکتے ہیں۔ پھر ان دونوں مکاتبِ فکر میں میدان الحاد و تجدد کی سیاوت و قیادت کا جذبہ بھی کارفرما ہے جو انہیں ایک دوسرے کا رقیب اور حریف بنانے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ ورنہ فرقِ باطلہ کے نفسیاتی مطالعہ اور ارشاداتِ نبوی کی روشنی میں اصلِ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں سب ایک ہیں۔ طریقِ کار، اندازِ بیان اور تعبیرات میں فرق ہے۔

چودھویں صدی کے اباحیت زدہ لوگوں کو اسلامی اقدار سے فرار کے لیے مستشرقینِ یورپ، ہمارے ہاں کے اہلِ تجدد اور اسلام کے تعمیرِ نو (NEW CONSTRUCTION) کا نعرہ لگانے والوں اور اس کو حالات اور ظروف کا تابع بنانے والوں کی یہ تحقیق خوب بھاتی ہے کہ ہوس زدہ عوام کی اکثریت اور دین سے عموماً بے خبر عامۃ الناس کی خواہشات اور فیصلوں کو دین میں سنتِ جاریہ، آزاد اجماع، شخصی اجتہاد وغیرہ کے نام سے حجت اور اتھارٹی کا مقام دے دو۔ پھر دیکھو کہ جو فواحش اور منکرات دین میں قطعی حرام تھے، کسطرح وہ یکایک عامۃ الناس کے اپنانے سے جائز اور حلال بلکہ قانون اور شریعت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر اس "آزاد اجماع" اور "شخصی رائے" کو احکام شرعیہ کا ماخذ اور "سنتِ جاریہ" مان لیا جائے تو پھر کون ہے جو سینما بے پردگی، فحاشی، سود بنکنگ جوا الغرض یورپ کے تمام اخلاقی معاشرتی اور اقتصادی مسائل کو اسلام سے مخالف کہہ سکے۔ کل اگر آزاد شخصی رائے سے تشکیل پائی ہوئی "سنتِ جاریہ" سوشلزم کو پسند کرے، پرسوں کمیونزم یا کیپٹل ازم کو اور کچھ عرصہ بعد دجال اور اسکی لائی ہوئی یورپی تہذیب کو گلے لگائے تو ان میں سے ہر چیز کو سنتِ نبوی کا مقام حاصل ہو جائے گا۔ والعیاذباللہ

ذرا اور گہرائی میں جائیے تو نتیجہ کے لحاظ سے "سنت اور حدیث" سے تلاعب اور تمسخر کرنے والی دونوں جماعتیں اس نکتہ پر اکٹھی ہو جاتی ہیں کہ "اطاعتِ رسول" اور شریعت کی بجائے ہر دور کے عوام کے فیصلوں کو وہی حیثیت دیدو جو رسول اور اسکی سنت کو حاصل ہے۔ البتہ پرویزی مکتبِ فکر میں اسکی تعبیر "مرکزِ ملت" کے نام سے کی جاتی ہے اور متجددین کے ہاں "زندہ اور مردہ سنت" سے اور کبھی آزاد اجماع اور "اجتہاد" کی آڑ میں عوام یا ان کی منتخب کردہ پارلیمنٹ (مقننہ۔ اگر اسے اسلامی نقطۂ نظر سے مقننہ کہنا جائز بھی ہو) کو ہر قسم کے فیصلوں کا حق دیا جاتا ہے۔ خواہ ان فیصلوں کا مقصد کتاب و سنت اور اس کے منصوص احکام کو "ویٹو" کرنا ہی کیوں

نہ ہو۔ اور اس خودساختہ اجماع سے امت کے پچھلے تمام اجماعی مسائل کا توڑ کیوں نہ ہو رہا ہو۔

پھر اس غلط اور خطرناک تصورِ اجماع کا پروپیگنڈا اس زور شور سے کیا گیا ہے کہ بدقسمتی سے اور تو اور ہمارے قابلِ احترام صدرِ مملکت تک اس نظریہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اپنی کتاب "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" کے گیارھویں باب۔ آئین اور نظریہ حیات " میں انہوں نے اجماع " کے اسی مفہوم کو اپنا لائحہ عمل بنانا چاہا ہے۔ اور چونکہ ملکی آئین اور ضابطہ حیات کی تشکیل میں صدرِ محترم کو اہم ترین مقام حاصل ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ انہی خطوط پر وہ ملک کی قانون سازی کو پسندیدہ سمجھتے تھے جس کے اثرات سے مستقبل میں پورے ملک کے مسلمان اکثریت کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ اجماع کا وہ تصور جو اسلاف نے کتاب و سنت کی روشنی میں ہمیں دیا ظاہر ہے کہ اس کے لئے جو اہلیت اور صلاحیت ملحوظ رکھی گئی تھی، عوام تو کیا اس دور کے خواصِ امت تک میں اس کا پایا جانا مشکل ہے۔ صدرِ محترم کے خیال میں ایسے اجماع سے جمہوری قدروں کی پامالی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ قانون و شریعت پر علماء یا دینی علوم سے وابستہ کسی خاص گروہ کی اجارہ داری ناجائز سمجھتے ہیں اور زمانۂ جدید میں اجماع کا مصداق قانون ساز اداروں کی رائے ہی کو قرار دیتے ہیں۔

حالانکہ ظاہر ہے کہ اسلام میں "علماء اور ملا" کسی خاص رنگ و نسل یا کسی مخصوص پیشہ یا کسی خاص قوم و نسب سے نسبت رکھنے والی جماعت کا نام نہیں، نہ اسلام میں اس پاپائیت اور برہمنیت کی گنجائش ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں سے جو بھی چاہے بلا امتیاز رنگ و نسل اور بلاتفریق قوم و پیشہ، کتاب و سنت اور اسلامی علوم کا صحیح علم و فہم حاصل کر کے عالم بن کر منصبِ وراثت نبوت پر فائز ہو سکتا ہے۔ رنگ و نسل کا امتیاز تو کیا دین کی ترجمانی کا یہ منصب جلیل مسلمانوں کی عورتوں اور غلاموں تک کو نصیب ہو سکتا ہے۔ تو پھر اصل معاملہ "ملا" کی اجارہ داری کا کب رہ جاتا ہے۔؟ اس صورت میں اگر ہم "ملا" کا نام لے کر دین کی اجارہ داری اور تعبیر و ترجمانی میں اپنے آپ کو شریک کرنا چاہیں تو درحقیقت ہم تشریع اور قانون سازی کے لئے کتاب و سنت کی بالادستی اور اجارہ داری کے روادار نہیں ہوں گے ۔۔۔ بیشک اسلام نے جمہور امت اور مسلمانوں کے عمومی پسند اور انتخاب کی اہمیت تسلیم کی ہے۔ یہاں تک کہ اسے اجماع، استحسان، عرف، اور تعاملِ امت کے نام سے اسلامی قانون کا ایک اہم رکن قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس

نے یہ بھی لازم کر دیا ہے کہ جمہور کا کوئی فیصلہ نہ تو کتاب و سنت اور خدا و رسول کی مرضی اور دین کے عمومی مزاج سے متصادم ہو اور نہ کسی چیز کو اپنانے میں خواہش پرستی، نفس پروری اور دین سے گریز کا داعیہ شامل ہو۔ جمہوریت کے نام سے دین اور شریعت میں عوام کو اسطرح کی آزاد قانون سازی کا حق دینا بالکل ایسا ہی ہے کہ ہم ملک کی تعمیری اور ترقیاتی منصوبوں میں کسی انجینئر کی رائے اور قابلیت سے استفادہ کی بجائے عام لوگوں کو جنہیں انجینئرنگ کی معمولی شد بد بھی نہ ہو سارا کام سپرد کر دیں، کسی قابلیت اور صلاحیت کے بغیر عوام کو تربیلہ اور منگلا جیسے بھاری بھرکم منصوبوں کی تعمیر و تشکیل کا کام سپرد کر دینا جمہوریت پروری نہیں بلکہ جمہور اور جمہوری اقدار سے دشمنی ہوگی۔ اسی طرح ڈاکٹری اور میڈیکل کو لیجئے، لوگوں کی صحت، بیماری اور خصوصاً اجسامِ انسانی کی چیر پھاڑ جیسا نازک کام عوام کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ کیا ملک کے ہر شخص کو جان بلب مریضوں کے اپریشن کا حق اس لئے دیا جا سکتا ہے کہ اسے منع کرنا جمہوریت کی پائمالی ہوگی۔؟ نہیں! بلکہ میڈیکل کا نازک ترین کام وہی شخص انجام دے سکے گا جسے مطلوبہ قابلیت، تعلیم، ڈگری اور تجربہ پورے طور پر حاصل ہو۔ اور کیا ملک کے ہر شہری کو خواہ وہ مروّجہ عدالتی قوانین اور عدالتی نظام سے معمولی آگاہی بھی نہ رکھتا ہو یہ حق دیا جا سکے گا کہ وہ چیف جسٹس یا پورے عدلیہ کے فیصلوں کو چیلنج دے سکے، یا قتل جیسے مقدموں کا فیصلہ کرتا پھرے، یا اُسے وکالت کا اختیار دیا جائے۔۔۔ پس ظاہر ہے کہ جب دنیاوی علوم میں اس قسم کی اجارہ داری کو ہم جمہور کی حق تلفی قرار نہیں دے سکتے تو دین، شریعت، اور زندگی پر لاگو ہونے والے قوانین کے لئے مخصوص شرائط قیودات اور خاص قسم کی قابلیت اور اہلیت کے التزام کو کیوں جمہوری اقدار کی خلاف ورزی سمجھا جائے؟

پس بلاشبہ شریعت نے ہر کس و ناکس کو نہ تو اجتہاد کا حق دیا ہے نہ شخصی رائے پر اٹھائے گئے آزاد اجماع کو وہ دین کا اصل قرار دیتا ہے۔ بلکہ اجماع ایسے لوگوں کا ہی معتبر ہوگا جو خدا ترسی، تقویٰ، خشیت، فراست، ایمانی، بصیرت دینی، جذبۂ خیر خواہی وحق کوشی جیسی صفات سے مالامال ہوں، علمی اور فنی لحاظ سے ہر طرح کامل مکمل جامع اور عبقری شخصیتیں ہوں۔ ان کا کوئی فیصلہ تعصّب، تحزّب، عناد، جہل، خودغرضی اور خواہشاتِ نفسانی پر مبنی نہ ہو اور پھر ان کے فیصلوں کے لئے اللہ، رسول اور عہد صحابہ و تابعین سے کوئی قوی "سند" بھی موجود ہو۔۔۔ ایسے ہی لوگ اجتہاد و استنباط کے اہل ہوں گے اور ایسے ہی تمام بزرگوں کا اتفاق "اجماع"

قرار پائے گا۔ ممکن تھا کہ آج بھی ان شرائط اور قابلیتوں کے ساتھ اجتہاد کا دروازہ کھولا جا سکتا مگر افسوس! کہ واقعاتی دنیا میں صدیاں ہوئیں وہ کنجی گم ہو چکی ہے جسے لیکر ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ احمد بن حنبلؒ اور مالک رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے اساطین علم و فضل یہ دروازہ کھولا کرتے تھے ۔۔۔ ؏ اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لیکر۔

بہر تقدیر اسلام کی نظر میں اصل اطاعت اللہ اس کے رسول اور اصل مقام کتاب و سنت اور اس سے مستنبط احکام ۔۔۔ ول کا ہے۔ اگر امت کی اکثریت یا مسلمانوں کی منتخب کردہ کوئی پارلیمنٹ کسی غیر شرعی فیصلہ یا کسی گمراہی پر متفق ہو بھی جاتے تب بھی امت میں ایک مضبوط جماعت ہمیشہ ایسی پائی جائے گی جو اس "اجماع ضلالت" کی نہ صرف مخالفت بلکہ حق کی اعلان و اشاعت کرتی رہے گی۔ مجموعی امت گمراہی پر حسب بشارت نبویؐ (لا تجتمع امتی علی الضلالۃ) ہرگز متفق نہیں ہو سکتی، بنا بریں نہ تو مرکزِ ملت یا قوتِ حاکمہ کو اطاعت رسول سمجھا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہم یورپ کے اسلام دشمن یہود و نصاریٰ سے درآمد شدہ نظریات کو سنت جاریہ کہہ سکتے ہیں اور نہ زنا بالرضا جیسے صریح فاحشہ کو قانونی حیثیت دینے پر اتفاق کرنے والی پارلیمنٹ کے فیصلوں کو "اجماع" قرار دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ جسطرح دیگر دینی اصطلات، صلوٰۃ، صوم، حج، زکوٰۃ، قربانی وغیرہ کا ایک خاص شرعی مفہوم ہے۔ جسے نہ تو بدلا جا سکتا ہے۔ نہ ان میں "توسیع" اور ترمیم ہو سکتی ہے اور جسطرح "کتاب" سے مراد وہی قرآن کریم ہوگا جسے امت اب تک متواتر آسمانی صحیفہ مانتی چلی آرہی ہے۔ اسی طرح سنت، اجماع اور اجتہاد کے وہی معانی قابلِ قبول ہوں گے جو عہد صحابہؓ سے لیکر اب تک متواتر چلے آرہے ہیں اور جسطرح کتاب، وحی، نبوت، رسالت وغیرہ الفاظ کے شرعی مفہومات قطعی اور اس میں تحریف و تبدیل اور ظلی بروزی کی تفریق الحاد، کفر اور زندقہ ہے، اسی طرح اسلام کے اصول اربعہ، کتاب، سنت اجماع و اجتہاد کو اپنے اصلی معانی سے الگ کرنا اور اسے اپنے من مانی معانی پہنانا تحریف فی الدین اور دین سے تلاعب اور مذاق ہی سمجھا جائے گا، جسے امت کا عمومی دینی مزاج قیامت تک برداشت نہیں کرے گا۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

سمیع الحق
۳ جمادی الاولیٰ

حضرت علامہ شمس الحق افغانی مدظلہ

سوشلزم

مذہب، اخلاق اور مساوات کے آئینہ میں

سرمایہ داری، کیمونزم اور اسلام پر حضرت علامہ افغانی کے معرکۃ الآراء مضمون کا ایک اہم حصہ الحق میں شائع ہو چکا ہے۔ اب حضرت مولانا موصوف نے کیمونزم اور سوشلزم کے بعض اور گوشوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ اس حصہ میں مغربی تہذیب اور قدیم و جدید کے مسئلہ پر بھی حضرت مولانا نے بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ ہم الحق میں مولانا کے افادات کا یہ غیر مطبوعہ حصہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں —————— "ادارہ"

★

سوشلزم اور مارکسیت اس سے قائم ہوتا ہے کہ انسان کو مذہب سے لڑایا جائے۔ چنانچہ واٹ کیمونزم از ویب صفحہ ۱۴ میں ہے کہ کیمونزم کا ممبر اس شخص کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا جو صدق دل سے صاف صاف اس بات کا اعلان نہ کر دے کہ وہ دہریہ ہے۔ یعنی منکر خدا ہے۔

اینجلز لکھتا ہے کہ ہماری پارٹی طبقہ وار شعور رکھتی ہے، اور مزدوروں کی آزادی کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔ ایسی پارٹی مذہبی اعتقادات سے پیدا کردہ جہالت سے غفلت نہیں برت سکتی۔ ہمارا ایک بنیادی مقصد ہے کہ مذہبی فریب خوردگی کو دور کیا جائے۔ (اینجلز ص ۱۵)

مذہبی فریب خوردگی سے نجات دلانے کے لئے خلاف الوہیت (خدا) سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جس کا نصب العین اس کے الفاظ میں یہ تھا کہ ہم نے آسمانی زاروں کو تو عرش سے اتار پھینکا ہے جس طرح ہم نے اس زمین کے زاروں کو اتار پھینکا ہے۔ (حاشیہ اشتراکیت اور اسلام مسعود عالم ص ۸)

مارکس نے مذہب کے انفرادی معاملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں قدم آگے بڑھا کر انسانی

ضمیر کو مذہب کے اقتدار سے آزاد کرانا ہے۔

مذہب پر تنقید علم تنقید کا مبدء ہے۔ (مارکس سوشلزم نمبر صفحہ ۱۹۲۔)

مذہب عوام کے حق میں افیون کا اثر رکھتا ہے۔ (بحوالہ سابق)

مذہب ازمنہ قدیمہ کی نظامی غلامی کی بازگشت ہے۔ (کمیونسٹ مینوفیسٹو کی تشریح دفعہ ۵۵ از ریزینوف)

ضابطۂ اخلاق جو انسانی سماج سے باہر لیا گیا ہے۔ ہمارے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ ایک ڈھونگ ہے۔ ہمارا ضابطۂ اخلاق طبقاتی تصادم کے مفاد کا تابع ہے۔ (لینن)

ان مختصر جوابات سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ سوشلزم صرف ایک معاشی تحریک نہیں بلکہ ایک جدید مذہب ہے جو تمام ادیان سابقہ اور الٰہی تعلیمات اور اخلاقی اقدار اور خود سر چشمۂ دین حق یعنی ذات خداوندی کے خلاف ہے۔ اور کامریڈوں کی درندگی کی راہ میں سے ہر رکاوٹ کو دور کرنا اس دین جدید یا دین یہودی کا مقصد ہے۔ دین سوشلزم جو دشمن انسانیت ہے۔ اس کے بانی شوپن ہاد، مارکس و لینن ہیں، جو یہودی تھے اور جن کا قول تھا کہ ہم نے بے زبان حیوانات پر تو سواری کی، اب ہم نے اس زمانے میں انسانوں کو سواری بنا دیا جن کو جانوروں کیطرح استعمال کیا گئے۔ (طنطاوی تفسیر الجواہر ج ۲ ص ۱۲)

تمام لڑائیوں کے درپردہ یہودی تھے۔ اب سوشلزم پرستی کا خلاصہ تمام بشری تاریخ اور تعلیمات آسمانی اور خود خدا سے کٹ کر ایک مغضوب یہودی قوم کے تین افراد کے بنائے ہوئے لائحہ حیات یا دین سے اپنی زندگی کو وابستہ کرنا ہے۔ باقی ہم نے سوشلزم کے متعلق جو کہا ہے کہ وہ دین ہے۔ یہ بات غیر تحقیقی نہیں، بلکہ کمیونسٹ پارٹی کا ترجمان ڈگلس ہائیڈ نے لکھا ہے کہ اشتراکی کارل مارکس اور انجلز کو وہ درجہ دیتے ہیں جو صحف سماویہ کو دیا جاتا ہے۔ اس طرح چین میں ماوزے تنگ کی لال کتاب کی چینی تلاوت کرتے کرتے ہوائی جہاز اتارتے ہیں۔ یہ ان کے مذہبی جذبے کا اظہار ہے۔ اس لئے والٹیر نے کہا اگر خدا نہیں تو ہمیں ایک خدا بنانا پڑے گا۔ یہ وہ عاجز مصنوعی خدا ہے جو حقیقی خدا کی جگہ سوشلزم کے پرستاروں سے پجوایا جاتا ہے۔

سوشلزم مزدور اور کاشتکار نوازی کے آئینہ میں سوشلزم تحریک تبلیغی کم اور جبری زیادہ ہے۔ اس لئے اولاً اس تحریک کے لیڈر مزدور اور کاشتکار کی خوشحالی کا نعرہ لگاتے ہیں۔ جب ان کو اپنے ساتھ ملا کر ایک طاقتور جماعت وہ پیدا کر لیتے ہیں تو ان کے ذریعہ حکومت وقت کو الٹ دیتے ہیں اور ان کی مزدوروں اور کسانوں کی حکومت کے نام پہ اپنی حکومت قائم

کرلیتے ہیں۔ چونکہ اس دین جدید میں اخلاق اور کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ جیسے کہ ہم نے بیان کیا تو حکومت پھر زمین کا اکثر حصہ کسانوں اور کاشتکاروں سے چھین کر اجتماعی کاشت کے نام پر اپنے قبضے میں کرلیتی ہے۔ اور برائے نام چند ایکڑ بطور شخص ملکیت کاشتکاروں کے حوالہ کردیتی ہے۔ اور اگر کاشتکار زمین چھیننے میں مزاحمت کرتے ہیں تو ظالمانہ طریقے سے ان کا خون بہایا جاتا ہے۔ گویا بعد از قیام سوشلزم حکومت انکی جنگ بجائے سرمایہ داروں کے کاشتکاروں سے ہوتی ہے۔ تھوڑی زمین جو کاشتکاروں کے پاس رہ جاتی ان کی کل پیداوار حکومت ان سے ارزاں قیمت پر خرید لیتی ہے۔ اور پھر جب ان کو ضرورت ہوتی ہے تو وہی پیداوار ان پر گراں قیمت پر فروخت کردیتی ہے۔ اسی طرح دیگر ضروریات حیات جن پر حکومت کا قبضہ ہوتا ہے۔ حکومت ان پر عام نرخ سے گراں نرخ پر فروخت کرتی ہے جس سے انکی معاشی حالت اور معیار زندگی نہایت پست ہوجاتا ہے۔

سوشلزم کا مزدور مزدوروں کو سوشلزم اور اشتراکی حکومت کارخانوں میں حیوانات کی طرح کام پر لگا دیتی ہے۔ ان کی محنت سے جس قدر پیداوار حاصل ہوتی ہے اس پر حکومت کا قبضہ ہوتا ہے۔ اور انہی پر مصنوعات کو من مانی قیمت پر فروخت کرتی ہے۔ ظاہراً مزدوروں کی اجرت دیگر ملکوں سے معمولی طور سے زیادہ مقرر کی جاتی ہے تاکہ پروپیگنڈے کا سامان ہاتھ آئے۔ لیکن اسی حاصل کردہ اجرت سے وہ اشیاء ضرورت خریدتے ہیں جن پر حکومت کا قبضہ ہے اور انہی کی محنت سے وہ بنی ہوئی ہوتی ہے۔ تو اسقدر گراں قیمت پر حکومت ان پر وہ اشیاء فروخت کرتی ہے۔ اسطرح حکومت نے مزدوروں کو ایک ہاتھ سے جو کسی قدر زائد اجرت دی تھی اس کا ڈبل بلکہ بعض اوقات ڈبل سے زیادہ واپس حکومت کے پاس آجاتی ہے۔ گویا جو ایک ہاتھ سے دیا دوسرے ہاتھ سے وہی واپس لے لیا ــــــ پھر بڑی مصیبت یہ ہے کہ روس میں عام صرف کی اشیاء کم بنتی ہیں۔ اور بڑی بڑی مشینیں یا آلات جنگ زیادہ تیار ہوتے ہیں۔ اس لئے عام ملکوں سے بلکہ غیر ترقی یافتہ ملکوں کی نسبت بھی روس میں اشیاء صرف کی یافت کم ہے یہی وجہ ہے کہ بیرونی ممالک میں جاپان وغیرہ ممالک کی نسبت آپ روسی ضروریات عامہ کی چیزوں کو کم پائیں گے۔

سوشلزم مساوات کے آئینہ میں بظاہر سوشلزم ممالک مساوات کے مدعی ہیں اور یہ کہ وہاں کوئی طبقاتی فرق نہیں لیکن واقعات اس کے خلاف ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ شخصی ملکیت

بری چیز ہے، لیکن واقعات اسکی تردید کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا امور کے لئے ہم "سوشلزم" مطبوعہ ۱۹۶۷ء کے چند حوالہ جات پیش کرتے ہیں :-

۱۔ روس کا کل رقبہ ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ مربع میل ہے، جس میں صرف ۶۰ لاکھ مربع میل پر روسی آباد ہیں۔ باقی ایک کروڑ ۷۰ لاکھ پر غیر روسی آباد ہیں۔ باشندگان روس کی کل تعداد ۲۲ کروڑ ہے جس میں ۱۰ کروڑ روسی ہیں اور باقی سب غیر روسی ہیں، جن میں ۵ کروڑ قتل سے بچے ہوئے مسلمان ہیں۔ محنت اور فوجی خدمت کا کام غیر روسیوں سے لیا جاتا ہے۔ غیر روسیوں کو ملک کے دور دراز علاقوں میں محنت کے لئے پھیلا دیا گیا ہے۔ اور اعلیٰ عہدے سب روسیوں کے پاس ہیں، جس سے دعویٰ مساوات کی حقیقت کھل جاتی ہے۔

۲۔ روس میں زرعی عمدہ زمین کے ساڑھے اٹھانوے فی صد ۹۸½ پر اجتماعی کاشت کے سلسلے میں حکومت کا قبضہ ہے اور صرف فی صد کسانوں کی ملکیت ہے۔ لیکن اس شخصی زراعت کی آمدنی روس کی تمام آمدنی کی ۳۲ فی صد اور اجتماعی زراعت کی آمدنی کل روس کی زرعی آمدنی کا ۶۸ فی صد ہے جس سے نظری شخصی ملکیت کی نفع بندی اور برتری ثابت ہوتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کل رقبہ میں لمبے چوڑے دعوؤں کے باوجود کسانوں کے ہاتھ میں زمین صرف ڈیڑھ فیصد ہے۔ باقی ان سے بزور چھین لی گئی ہے۔ اسی کتاب میں تصریح ہے کہ کسانوں سے اجتماعی کاشت کے نام پر جو زمین چھینی گئی۔ اس میں ایک کروڑ انسان قتل ہوئے اور اسٹالین نے خود گذشتہ جنگ عظیم کے موقعہ پر یالٹا کانفرنس میں چرچل سے کہا کہ اس جنگ کے اتلاف جان سے ہم نے اجتماعی کھیتوں کے قبضے کے وقت جانوں کی زیادہ قربانی دی۔

۳۔ غیر روسیوں کی روس کے جس رقبہ پر سکونت ہے، وہ رقبہ ۹۵ لاکھ کیلو میٹر ہے، جو امریکہ کے کل رقبے سے زیادہ ہے کیونکہ امریکہ کا رقبہ ۹۳ کیلو میٹر ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی کمائی خود ان کے کام کم آتی ہے اور زیادہ روسیوں کے ہاتھ آتی ہے۔

۴۔ عوام بدتر بدحالی کے شکار ہیں۔ بھارتی وفد جس کا صدر کنور بھائی لال جی بھا، جب روس کے دورے سے واپس آیا تو اس نے بھارتی پارلیمنٹ میں یہ بیان دیا جو اخبارات میں چھپ گیا کہ روس میں معیار زندگی پست ہے۔ ایک پونڈ مکھن کی قیمت ۲۱ روپے اور ایک قمیض کی قیمت ۱۲۰ روپیہ۔ ایک سائیکل کی قیمت ۸۰۰ روپیہ ہے۔ ہندوستان کا وہ ملازم جسکی تنخواہ

۸۰ روپیہ ماہوار ہو، روس کے مزدور سے خوشحال ہے، جسکی تنخواہ ایک ہزار روپیہ ماہوار ہو۔۔۔
(نوائے وقت ۳ ستمبر ۱۹۵۵ء)

۵- مساوات کا یہ حال ہے کہ استالن کی سالانہ تنخواہ ۰ لاکھ بیس ہزار روبل تقریباً ۹ لاکھ پاکستانی روپے تھی۔ اور تیس کوٹھیوں اور چار موٹروں کے لیئے ایک لاکھ روبل تقریباً سوا لاکھ کی رقم الگ مقرر تھی۔ اور تمام اشیاء صرف کردہ ان اشیاء کی لاگت سے اسّی فی صد کم پر خرید تا تھا۔۔۔
(رسالہ فریڈم فرسٹ، مندرجہ پاسبان کوئٹہ ۲۰/دسمبر ۱۹۵۲ء)

لیکن نورالدین زنگی بادشاہ اسلام جس نے متحدہ یورپ کو شکست دی تھی اس کا کل ترکہ جس میں دو دوکانیں تھیں، جس کا کرایہ تیس دینار یعنی ۵، روپے ماہوار پاکستانی سکّے کے برابر تھا۔ جہاد کے لئے اپنا گھوڑا نہ تھا۔ عاریتاً لیتا تھا اور جہاد سے واپس ہو کر مالک کو واپس کر دیتا تھا۔

آن مسلمانان کی میرے کردہ اند در شہنشاہی فقیری کردہ اند

انسانی حریت اور سوشلزم حریت انسانی کی بنیاد شرافت ہے۔ حیوانات اس شرافت سے محروم ہیں۔ آزاد انسان ان سے کام لیتا ہے اور گھاس کھلاتا ہے۔ سوشلزم تحریک شروع میں کسانوں اور مزدوروں کی جماعت سے سب کچھ کراتی ہے۔ لیکن جب حکومت قائم ہو جاتی ہے تو اس سوشلزم حکومت کا پنجہ زندگی کی گہرائیوں میں اس قدر گڑ جاتا ہے۔ کہ عوام کے افکار عقائد سب لیڈران سوشلزم کے خیالات میں گم ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔ ان سے محنت لی جاتی ہے۔ اور لیڈر جیسا چاہتے ویسا کھانا کھلاتے ہیں، ان پر اگر ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہوں تو وہ اف نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ نہ تحریر کی آزادی نہ تقریر کی۔ نہ اجتماع کی اور نہ جلوس کی، ہڑتال تو بڑی چیز ہے۔ اور وہ ایسا کب کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کی ضروریات کی اشیاء حکومت کے ہاتھ میں ہیں پریس حکومت کے ہاتھ میں، تعلیم حکومت کے ہاتھ میں، خورد و نوش کا سامان حکومت کے ہاتھ میں، ایسا سمجھئے کہ سوشلزم ممالک کا وسیع رقبہ ایک وسیع جیل خانہ ہے۔ اور چند کامریڈ اس کے جیلر ہیں۔ ایم۔ وائی اشتراکی، ۱۹۴۰ء میں لکھتا ہے کہ روس میں عام مزدور کی ماہوار تنخواہ ۱۱۰ سے ۴۰۰ روبل تک ہے۔ روبل تقریباً پاکستانی سوا روپیہ کے برابر ہے۔ درمیانہ افسر تین سو ماہوار سے ایک ہزار روبل تک۔ اونچے افسر ڈیڑھ ہزار سے دس ہزار ماہوار تک اور بہت اونچے بیس ہزار سے تیس ہزار ماہوار روبل تک تنخواہ لیتے ہیں جو اکثر روسی ہیں۔ سٹالین نے مزدوروں کی تنخواہ میں اضافے کے جواب میں کہا :
"مارکسزم مساوات کا دشمن ہے۔ (مارکسزم نمبر ۱)۔۔۔ یہ حال ہے مزدوروں کا کسانوں کا۔۔۔!

اسی غیر فطری نظام کا نتیجہ ہے کہ روس اور چین دونوں کے تجربے نے ثابت کیا کہ سوشلزم کے اس اصول پر عمل کرنا کہ تمام زمین پر اجتماعی کاشت ہو، ناممکن العمل ہے۔ اور شخصی ملکیت میں ہاتھ ڈالنا زراعت کو تباہ کرنا ہے۔ بلکہ سوشلزم جذبۂ کار کے جوش کو ختم کرتا ہے۔ اس لئے یہ نظام صنعتی اور زراعتی پیداوار کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ دیکھئے سرکاری رپورٹیں روس اور چین کی مندرجہ سوشلزم نمبر از صـ۲۷ تا صـ۲۸۴ .... بقول اقبالؒ مرحوم ؎

اگر تاجے کئی جمہور پوشد — ہماں ہنگامہ ہا در انجمن است

ہوس اندر دلِ آدم نمیرد — ہماں آتش میانِ مرزغن است

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا — طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی ؎

مادی اور سوشلزم نظامِ حیات میں جب تاریخی ارتقاء ایک طے شدہ چیز ہے تو سوشلزم کے لئے پچاس سالہ محنت اور خون خرابہ اور قربانیوں کی کیا ضرورت تھی، کیونکہ طے شدہ ارتقاء کا ظہور لازمی تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب بیرونی عامل کا جس کو مشیت الٰہی کہا جا سکتا ہے۔ اسی کا اثر ہے جو اس جہاں کی ہر تبدیلی کا محرک ہے۔ اور یہ ایک ماوراالطبعیاتی عمل ہے۔ بہر حال سوشلزم کے باطن سے جو بھی واقف ہوگا اس کو ہر غیر سوشلسٹ ملک کا مزدور اور کسان آزاد اور خوشحال نظر آئے گا۔ پروپیگنڈے کی ساحری سے لاشعوری طور پر کچھ لوگ ضرور اسوۂ روس و چین کے شیدائی بنتے جا رہے ہیں۔ لیکن نتائج کے موازنہ کے بعد حقیقت کھل جاتی ہے کہ ایسا کرنے سے کھویا بہت کچھ جاتا ہے، اور ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ واللّٰہ الھادی الی سبیل الرشاد۔

اشتراکیت اس لامحدود جبر و تشدد کا نام ہے کہ نہ کوئی قانون اس پر حد بندی کر سکتا ہے اور نہ اخلاق۔ جبری "محنت" شروع میں مرد اور عورت دونوں سے لی جاتی رہی اور اپنے اصلی وطن سے اکھیڑ کر لاکھوں نہیں کروڑوں خاندانوں کو بہ جبر دور دراز علاقوں میں محنت لینے کے لئے دھکیلا گیا۔ پروداکی ۲۶ر جولائی ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں اس قانون کا اعلان کیا گیا کہ سٹرائک کرنے والوں کو ۱۵ سال قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ملازم کی ۲۰ منٹ محنت کے لئے تاخیر سے پہنچنے کی سزا بھی ۴ ماہ کی جیل ہے۔ اس طرح انہوں نے تشدد کو ایک مقدس عمل قرار دیا۔ لینن نے صاف اعلان کیا کہ یہ مت سمجھو کہ میں انصاف کی تلاش میں ہوں۔ اب انصاف کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی .... (بحوالہ نایاب تاثر صـ۲۱، صـ۲۲)

.... باقی آئندہ

مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ

مغربی تہذیب اور تجدّد کے علمبردار

علامہ اقبالؒ کی نظروں میں

★ مغربی تہذیب کے عناصر ترکیبی

★ آوازۂ تجدید یا تقلید فرنگ

★ پاکستان ایک اسلامی تجربہ گاہ مگر نازک امتحان

مشرق کے اہل نظر اور ذہین افراد میں (باوجود اس کے کہ ان میں سے اکثر کو مغرب کی سیر اور مطالعہ کا موقعہ ملا) کوئی ایسا نہ تھا جس نے مغربی تہذیب و افکار کا اتنی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو اور اس قدر جرأت کے ساتھ اس پر تنقید کی ہو۔ محمد اقبالؒ نے اس تہذیب کے عناصر ترکیبی اور اس کے کمزور پہلوؤں کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور اس فساد کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔

★

بیسویں صدی کے آغاز ہی میں مسلم نوجوانوں نے مغربیات کے مطالعہ و تحقیق کا آغاز کر دیا تھا۔ وہ ہندوستان کی اعلیٰ یونیورسٹیوں اور تعلیم گاہوں میں مغربی علوم و افکار کا گہرا مطالعہ اور تجربہ کر رہے تھے۔ فاتح تہذیب اور اس کے علمبرداروں سے مرعوبیت اب روز بروز کم ہو رہی تھی، ہندوستانی مسلمان اعلیٰ تعلیم کے لئے اب یورپ آنے جانے لگے تھے جن میں سے بعض یورپ کے بڑے بڑے تعلیمی مرکزوں میں طویل عرصہ تک قیام کر کے وہاں کے علمی سرچشمہ سے سیراب ہوتے اور جدید علوم کو ممتاز اور آزاد فکر اساتذہ کی رہنمائی میں حاصل کرتے، وہ مغربی تہذیب سے محض کتابوں کے ذریعہ نہیں بلکہ اس کے بہترین نمائندہ اشخاص کے ذریعہ تعارف حاصل کرنے اور اس کے قلب و جگر میں اتر کر اور اس کی تہ میں پہنچ کر اس سے اس طرح واقف ہونے کی کوشش کرتے جس طرح کوئی تعلیم یافتہ یورپین کر سکتا ہے۔ وہاں کے فلسفوں، نظاموں اور مختلف مکاتب خیال کا جائزہ لیتے اور ان کے مضمرات، حقائق و اسرار تک پہنچنے کی کوشش کرتے، ان کو مغرب کے ذہن و مزاج، اس کے قومی غرور اور احساس برتری اور اس کے عوام کی خود پسندی اور انانیت کو قریب سے دیکھنے

کا موقعہ ملتا، اس سوسائٹی میں زوال و انحطاط اور ذہنی افلاس کی ابتدائی علامتیں اور آثار ان پر واضح ہوئے وہ صالح اور تعمیری اجزاء بھی ان کی نظر میں آئے جو انسانیت کے لئے فلاح بخش ہو سکتے ہیں، اسیطرح وہ تخریبی اور انسانیت دشمن اجزاء بھی (جو اس تہذیب کے خمیر میں شروع سے موجود ہیں) ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو سکے۔ ان سب مشاہدات نے ان کے دل و دماغ میں ایسے احساسات اور معانی اجاگر کئے، جن کا حصول اتنے طویل قیام کے بغیر اور اس کے نظریات و افکار کے تقابلی مطالعہ، جرأت مندانہ اور گہری نظر، تقلید (مغرب) کی بندش سے خلاصی اور اس ایمان کی چنگاری کے بغیر جو ابھی بجھی نہ تھی۔ بلکہ راکھ کے ڈھیر میں دب گئی تھی اور کسی وقت بھی بھڑک اٹھنے کی منتظر تھی، ناممکن تھا۔

ان سب چیزوں کے مشاہدہ کے بعد ان میں بہت سے فاضل مغربی تہذیب سے مایوس ہو کر اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے بڑی گہرائی اور جرأت کے ساتھ اس پر تنقید کا ارادہ لے کر واپس ہوئے، ان کے فکر اور تنقید میں نہ انتہا پسندی تھی نہ واقعات کا انکار، نہ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا جذبہ۔

ان انقلابی ناقدین میں سب سے نمایاں نام علامہ محمد اقبال کا ہے۔ جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم جدید نے اس صدی کے اندر ان سے بہتر نمونہ پیش نہیں کیا، ان کو جدید مشرق کا سب سے زیادہ بالغ نظر مفکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ مشرق کے اہل نظر اور ذہین افراد (باوجود اس کے کہ ان میں سے اکثر کو مغرب کی سیر اور مطالعہ کا موقعہ ملا) کوئی ایسا نہ تھا جس نے مغربی تہذیب و افکار کی اتنی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو اور اس قدر جرأت کے ساتھ اس پر تنقید کی ہو۔

فسادِ قلب و نظر | محمد اقبالؒ نے اس تہذیب کے عناصر ترکیبی اور اس کے کمزور پہلوؤں کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور اس فساد کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی جو اس کے مادی رجحان، مذاہب اور اخلاقی و روحانی اقدار سے اہل مغرب کی بغاوت کی وجہ سے اس کے خمیر میں شامل ہو گیا ہے۔ انہوں نے قلب و نظر کے اس فساد کو جو اس تہذیب کی خصوصیت ہے روح تہذیب کی آلودگی و ناپاکی پر محمول کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید — ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف[1]

اس کا نتیجہ دل کی وہ بے نوری اور زندگی کی وہ بے کیفی ہے جو اس تہذیب پر بری طرح مسلط ہے۔

---

[1] ضرب کلیم ص ۶۹

اور اس نے اس کو ایک مشینی و مصنوعی رنگ دیکر روحانی قدروں سے اس کا رشتہ منقطع اور خدا کی رحمت سے اس کو دور کر دیا ہے، وہ کہتے ہیں:

یہ عیشِ فراواں یہ حکومت یہ تجارت دل سینۂ بے نور میں محرومِ تسلّی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلّی[1]

مادیت کے پرستار | انہوں نے اس تہذیب کی لادینی بنیاد اور اس کے لادینی خمیر کا جابجا ذکر کیا ہے جس کو مذہب و اخلاقیات سے بیر ہے۔ اور جو روحِ ابراہیمی سے متنفر ہوکر مادیت کے معبودانِ باطل کی پرستار اور ایک نئے بت خانہ کی معمار ہے، "مثنوی پس چہ باید کرد" میں فرماتے ہیں:

لیکن از تہذیبِ لادینی گریز ! زاں کہ او با اہلِ حق دارد ستیز
فتنہ ہا این فتنہ پرداز آورد لات و عزّٰی در حرم باز آورد
از فسونش دیدۂ دل نابصیر روح از بے آبیٔ او تشنہ میر
لذّتِ بے تابی از دل می برد بلکہ دل زیں پیکرِ گِل می برد
کہنہ دزدے غارتِ او برملاست
لالہ می نالد کہ داغِ من کجاست[2]

شیوۂ تہذیبِ فرنگ | اس تہذیب کا شیوہ غارت گری اور آدم دری ہے اور اس کا مشغلہ اور مقصد تجارت اور سوداگری ہے، دنیا کو امن و سکون اور بے غرض محبت اور خلوص کی دولت اسی وقت نصیب ہو سکتی ہے، جب اس تہذیبِ جدید کا نظام تہ و بالا ہو جائے — فرماتے ہیں:

شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است پردۂ آدم دری سوداگری است
ایں بنوک ایں فکرِ چالاک یہود نورِ حق از سینۂ آدم ربود
تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام دانش و تہذیب و دیں سودائے خام[3]

یہ تہذیب اگرچہ (اپنی عمر و تاریخ کے لحاظ) جواں سال و نو عمر ہے مگر اپنی غلطیوں اور بنیادی کمزوریوں کی وجہ سے عالمِ نزع میں گرفتار اور مکمل زوال کے لئے تیار ہے، اس تہذیب میں — "یہودی شاطروں" نے جو اقتدار حاصل کر لیا ہے، اس کے پیشِ نظر بعید نہیں کہ یہودی ہی اس مقدس ترکہ کے وارث ہوں — وہ کہتے ہیں:

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولّی[4]

---

[1] ضرب کلیم ص ۱۴۰ [2] ص ۴۱ ، [3] ص ۳۷ ص ۳۸ ، [4] ص ۱۴۱

لیکن بستر مرگ پر طبعی موت مرنے کی بجائے سارے آثار و قرائن اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ تہذیب خودکشی کا ارتکاب کرے گی اور خود اپنے خنجر سے اپنا گلا کاٹ کر اپنا کام تمام کرے گی۔
— فرماتے ہیں :

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

دین و اخلاق کے بغیر تسخیر کائنات | اس تہذیب نے دین و اخلاق کی نگرانی اور خوف خدا کی رفاقت کے بغیر تسخیر کائنات کا جو نازک سفر شروع کیا تھا، اس کی کامیابیوں نے خود اس تہذیب کے وجود بقا کو خطرہ میں ڈال دیا ہے، اور اندیشہ پیدا ہوگیا ہے کہ وہ خود اپنی آگ میں جل کر خاک نہ ہو جائے۔
— فرماتے ہیں :

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ [۱]

"سود و سودا اور مکر و فن" کی یہ دنیا جس کا فرنگی معمار ہے اب دم توڑ رہی ہے، اور ایک نئی دنیا جنم لے رہی ہے — وہ کہتے ہیں :

جہان نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ [۲]

وہ کہتے ہیں کہ یہ تہذیب علم کی ضیاء سے روشن اور زندگی کی حرارت سے شعلہ زن ہے وہ طبعیات و صنعت کے دائرہ میں وقتاً فوقتاً اپنے کمالات کا اظہار بھی کرتی رہتی ہے لیکن دراصل وہ انقلابی ایجاد و اجتہاد کی قوت سے محروم ہو چکی ہے۔ وہاں عقل کا نفع دل کا زیاں "ہے۔ اس کے رہنما خود تقلید کے بندے اور لکیر کے فقیر ہو چکے ہیں۔ اس کے مرکز اب نعرہ مستانہ، ادائے قلندرانہ اور جرأت پیمبرانہ سے محروم ہو چکے ہیں — کہتے ہیں :

یاد ایامے کہ بودم در خمستان فرنگ — جام او روشن تر از آئینہ اسکندر است
چشم مست مے فروشش بادہ را پروردگار — بادہ خواران را نگاہ ساقی اش پیغمبر است

---

[۱] [۲] بال جبریل ص ۱۶۶

جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل عقل ناپروا متاع عشق را غارت گر است

در ہوایش گرمی یک آہ بے تابانہ نیست

رند این میخانہ را یک لغزش مستانہ نیست [1]

روشن چہرہ مگر تاریک دل | ایک موقع پر اس تمدن کے روشن چہرہ لیکن تاریک دل کی تصویر اسطرح کھینچتے ہیں :

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

ظاہر ہے تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

مغربی تمدن اس کی بنیادوں اور اس کے طرز فکر پر یہ تنقید اور جائزہ ان کے علمی خطبات میں جو انہوں نے مدراس میں دیئے تھے اور جو RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM کے نام سے شائع ہوئے تھے، قدرتی طور پر زیادہ ٹھوس اور گہرا ہے : اس لئے کہ علم و فلسفہ کی زبان شعر و ادب کی زبان کے مقابلہ میں علمی خیالات اور جچی تلی تنقید کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ مغرب کی مادی تہذیب کی ساخت اور مزاج اور موجودہ انسان پر (جو اس کا نمائندہ اور علمبردار ہے) نیز ان مسائل اور مشکلات پر جن سے وہ دوچار رہے تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

"عہد حاضر کے تنقیدی فلسفوں اور علوم طبعیہ میں اختصاص نے انسان کی جو حالت کر رکھی ہے بڑی ناگفتہ بہ ہے ، اس کے فلسفۂ فطرت نے تو بیشک اسے یہ صلاحیت بخشی کہ قوائے فطرت کی تسخیر کرے ، مگر مستقبل میں اس کے ایمان اور اعتماد کی دولت چھین کر ،

عصر حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ان کے زیر اثر انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے ، یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے ۔ خیالات اور تصورات کی جہت سے دیکھئے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم ہے ۔ سیاسی اعتبار سے نظر ڈالئے تو افراد سے ، اس میں اتنی سکت

---

[1] پیام مشرق صفحہ ۲۴۸

ہی نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور ناقابلِ تسکین جوع زر پر قابو حاصل کر سکے، یہ باتیں ہیں جن کے زیرِ اثر زندگی کے اعلیٰ مراتب کے لئے اس کی جد و جہد بتدریج ختم ہو رہی ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ درحقیقت زندگی ہی سے اکتا چکا ہے، اسکی نظر حقائق پر ہے، یعنی حواس کے اس سرچشمہ پر جو اس کی آنکھوں کے سامنے ہے لہٰذا اس کا تعلق اپنے اعماق وجود سے منقطع ہو چکا ہے اور پھر جیسا کہ ہکسلے (HUXLEY) کو بھی خدشہ تھا اور جس کا بہ تاسف وہ اظہار بھی کر چکا ہے، مادیات کے اس باقاعدہ نشو و نما نے اس کے رگ و پے بھی مفلوج کر دئے ہیں لے

عصرِ حاضر کی لادین اشتراکیت کا مطمع نظر بیشک نسبتاً زیادہ وسیع ہے، اور اسکے جوش و سرگرمی کا بھی وہی عالم ہے جو کسی نئے مذہب کا، لیکن اس کی اساس چونکہ ہیگل (HEGEL) کے مخالف نظر متبعین پر ہے۔ لہٰذا وہ اس چیز ہی سے برسرِ پیکار ہے جو اس کے لئے زندگی اور طاقت کا سرچشمہ بن سکتی تھی؛ کے

وحشیانہ رسہ کشی | علامہ اقبالؒ مغربی سوسائٹی کو ایک ایسی سوسائٹی قرار دیتے ہیں جس کے پیچھے صرف وحشیانہ رسہ کشی کارفرما ہے، وہ اس کو ایک ایسی تہذیب کہتے ہیں جو دینی اقدار اور سیاسی اقدار کی کشمکش کی وجہ سے اپنی روحانی وحدت کھو بیٹھی ہے۔

وہ ایک واقف کار اور مبصر کی حیثیت سے سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کو شجرِ مادیّت کی دو شاخیں اور ایک ہی خاندان کے دو گھرانے قرار دیتے ہیں جس میں ایک مشرقی ہے اور ایک مغربی، لیکن مادی طرزِ فکر، زندگی اور انسان کے متعلق محدود نقطۂ نظر میں دونوں "ایک جان دو قالب" ہیں۔ ایک فکری اور تخیلاتی سفر میں، جس میں ان کی ملاقات سید جمال الدین افغانی سے ہوئی ہے۔ ان کی زبان سے یہ تبصرہ نقل کرتے ہیں :

هر دو را جاں ناصبور و ناشکیب   هر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج   درمیان ایں دو سنگ آدم زجاج
ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست   آں برد جاں را زتن ناں را زدست
غرق دیدم هر دو را در آب و گل   هر دو را تن روشن و تاریک دل

زندگانی سوختن با ساختن
در گلے تخم دلے انداختن ۳ے

لے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ صـ ۲۸۹، ۲۹۰   ۲ے ایضاً صـ ۲۹۱، ۲۹۲   ۳ے جاوید نامہ صـ

غربیاں گم کردہ اند افلاک را | در شکم جوینده جان پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جان پاک | جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس | بر مساوات شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ در آب و گل است[1]

مغربی تہذیب اور اسلامی ممالک | محمد اقبالؒ کا خیال تھا کہ مغربی تہذیب جو خود جاں بلب ہے اسلامی ممالک کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتی اور نہ اس میں دوبارہ زندگی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ کہتے ہیں :

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق اُن کو | آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر | یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور[2]

مغرب نے مشرق کو احسان کا جو بدلہ دیا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا | نبی عفت و غم خواری و کم آزاری[3]
صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کیلئے | مے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری[4]

مشرق میں تجدد کے علمبرداروں پر اُن کی تنقید | وہ اسلامی ممالک میں تحریکِ تجدید (لیکن زیادہ صحیح الفاظ میں "مغربیت") کے علمبرداروں سے بدگمان نظر آتے ہیں، اور یہ اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ تجدید کی دعوت کہیں تقلیدِ فرنگ کا بہانہ اور پردہ نہ ہو ـــــ کہتے ہیں :

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید | مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ[5]

وہ اس تحریک اصلاح و تجدید (مغربیت) کے علمبرداروں کی بے بضاعتی اور تہی مائیگی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

میں ہوں نومید تیرے ساقیانِ سامری فن سے | کہ بزمِ خاوراں میں لے کے آئے ساتگیں خالی
نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و دامن میں | پرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی[6]

وہ دوسروں کی تہذیب و افکار کی اندھی تقلید کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ ہر قوم کیلئے عار کی بات ہے نہ کہ اس قوم کے لئے ناقابلِ معافی گناہ ہے جو قوموں کی قیادت اور عالمی انقلاب

---

[1] جاوید نامہ ص ۶۹ [2] ضربِ کلیم ص ۹۸ [3] حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں [4] ضربِ کلیم ص ۱۵۱ [5] ایضاً ص ۱۶۱ [6] ضربِ کلیم ص ۶۹۔

کے لئے پیدا کی گئی ہے ___ کہتے ہیں:

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد	ہر دَور میں کرتا ہے طواف اسکا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو	کر اسکی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک	ہے جس کے تصوّر میں فقط بزمِ شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید	مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ[1]

وہ مشرق کی اسلامی اقوام کو ملامت کرتے ہیں جن کا منصبِ قیادت و رہنمائی کا تھا لیکن وہ پست درجہ کی شاگردی اور ذلیل قسم کی نقالی کا کردار ادا کر رہی ہے ___ غالباً ترکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وہ کہنہ دماغ اپنے زمانہ کے ہیں پیرو[2]	کر سکتے تھے جو اپنے زمانہ کی امامت

جاوید نامہ میں پرنس سعید حلیم پاشا کی زبان سے ترکی میں کمالی اصلاح و انقلاب کی سطحیت اس کے کھوکھلے پن اور اُس کے داعی و زعیم (کمال اتاترک) کی فکری کہنگی اور یورپ کی بے روح نقالی کی مذمت کھلے طریقہ پر کی ہے۔

مصطفےٰ کو از تجدد می سرود	گفت نقشِ کہنہ را باید زدود
نو نگردد کعبہ را رختِ حیات	گر ز افرنگ آیدش لات و منات
ترک را آہنگِ نو در چنگ نیست	تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست
سینۂ او را دمے دیگر نبود	در ضمیرش عالمے دیگر نبود
لاجرم با عالمِ موجود ساخت	مثلِ موم از سوزِ ایں عالم گداخت[2]

تہذیب، اسلامی اور اسکی حیات انگیزی پر یقین | وہ اسلامی تہذیب اور اسلامی شریعت کی لازوال قوت اور ایک نئی دنیا اور نئے معاشرہ کی تشکیل و تعمیر میں ان کے عظیم امکانات پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں جو ۱۹۳۲ء میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس میں دیا تھا، مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"جس دین کے تم علمبردار ہو وہ فرد کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتا ہے۔ اور اس کی اسطرح تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور بندوں میں صرف کر دے، اس دین قیم

---

[1] ضربِ کلیم صنئلا [2] بالِ جبریل [3] ص[2]

کے مضمرات ابھی ختم نہیں ہوئے۔ یہ دین اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کرسکتا ہے جس میں غریب امیروں سے ٹیکس وصول کریں جس میں انسانی سوسائٹی معدوں کی مساوات پر نہیں بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو۔"

جدید اسلامی تجربہ گاہ | ان کو پورے اخلاص کے ساتھ اس کا یقین اور احساس تھا کہ ایک ایسا خود مختار خطہ مسلمانوں کے لئے بے حد ضروری ہے جہاں اسلامی زندگی کا "عمل" اپنے سارے شعبوں اور پہلوؤں کے ساتھ جاری رہ سکے اور شریعت اسلامی اور زندگی کا اسلامی طریقہ اپنی خدا داد صلاحیتوں اور جوہر کا آزادی کے ساتھ اظہار کرسکیں اور چونکہ ہندوستان ہی (جیسا کہ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس کے خطبہ صدارت میں کہا تھا) ایک ایسا ملک ہے، جہاں سب سے بڑا اسلامی مجموعہ آباد ہے، اس لئے وہ اس تجربہ کے لئے سب سے زیادہ موزوں جگہ ہے۔ اور یہاں وہ اسلامی مرکز، زیادہ گہرے الفاظ میں وہ لیبارٹری قائم ہوسکتی ہے، جہاں صالح سوسائٹی کی تشکیل، اجتماعی زندگی کی تنظیم، اقتصادی مسائل کا حل اور تہذیب کی صحیح و پاکیزہ رہنمائی اعقیدہ اور عمل، مادیت اور روحانیت اور فرد و جماعت کی ایک ایسی ہم آہنگی پیدا ہوسکے جو لوگوں کو تعجب و اعتراف پر مجبور کرے اور اسلامی ممالک کے رہنماؤں کو اس کی تقلید اور دنیا کے مفکرین کو نئے طرز پر سوچنے پر آمادہ کرسکے۔

یہ سیاسی بالغ نظری اور بلند ہمتی جس کی نظیر اس دور میں عالم اسلام میں مشکل سے ملے گی۔ مملکت پاکستان کی بنیاد تھی۔ ۱۹۴۷ء میں یہ خواب پورا ہوا اور پاکستان وجود میں آیا۔ پاکستان کے اولین معماروں نے بھی اس فکری بنیاد کو تسلیم کیا جس پر اس عظیم ترین اسلامی ریاست کی تعمیر ہوئی تھی، اور اس کو اسلامی طریق زندگی کا ایک عمل یا تجربہ گاہ قرار دیا۔

مسٹر محمد علی جناح نے اپنی ایک تقریر میں جو انہوں نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے بری بحری اور فضائی فوج کے افسران اور سول حکام کے سامنے کی تھی، کہا:

"پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم دس سال سے کوشاں تھے بفضلہ تعالیٰ اب ایک زندہ حقیقت ہے، لیکن خود اپنی مملکت کا قیام ہمارے مقصد کا صرف ایک ذریعہ تھا۔ اصل مقصد نہیں تھا، منشا یہ تھا کہ ایسی مملکت قائم ہو جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہیں، جس کو ہم اپنے مزاج اور ثقافت کے مطابق ترقی دیں اور جس میں اسلامی عدل اجتماعی کے اصول آزادی کے ساتھ برتے جائیں ۔۔۔"

(SPEECHES QUAID-I-AZAM MOHAMMAD ALI JINNAH, P. 22)

لیاقت علی خان مرحوم نے ۱۴ جنوری ۱۹۴۸ء کو پشاور کے ایک اجتماع میں کہا:

"پاکستان ہمارے لئے ایک تجربہ گاہ ہے۔ اور ہم دنیا کو دکھلائیں گے کہ تیرہ سو برس پرانے اسلامی اصول کس قدر کار آمد ہیں۔"

ایک دوسرے موقع پر ۱۹۵۰ء میں انہوں نے ایک تقریر میں کہا:

"ہم نے پاکستان کا مطالبہ اس بنا پر کیا تھا کہ مسلمان اپنی زندگی اسلامی احکام کے قالب میں ڈھالیں، ہم نے ایک ایسے محل کے قیام کا مطالبہ کیا تھا جہاں ایک ایسی حکومت بنائی جا سکے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو، جن سے بہتر اصول دنیا پیدا نہیں کر سکی ہے۔"[1]

لیکن یہ تجربہ جو اپنی اہمیت، نزاکت اور اپنے دور رس نتائج کے اعتبار سے تاریخ کا ایک اہم ترین اور عہد آفریں (EPOCH-MAKING) واقعہ تھا، ان ہی رہنماؤں کے ہاتھوں کامیاب ہو سکتا تھا، جو اسلامی شریعت کی ابدیت اور اسلامی تہذیب کی برتری پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہوں، جن کا خلوص اور صداقت، خود غرضی، مفاد پرستی اور مصلحت کوشی سے پاک اور ہر شبہ سے بالاتر ہو، اُن کا ذہن مغربی اقدار و افکار کی غلامی اور ان کی سیرت غیر اسلامی تعلیم و تربیت کے اثرات سے بالکلیہ آزاد ہو چکی ہو اور ایمان راسخ اور اخلاقی جرأت کے ساتھ وہ جدید علوم کے پیدا کردہ وسائل اور قوتوں کو اپنے اعلیٰ دینی و اخلاقی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی قدرت اور آزاد و جدید اسلامی معاشرہ کے ماحول کے مطابق ان کو ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

نازک امتحان لیکن اس تجربہ کو کامیاب بنانے اور تاریخ کے اس نادر و زریں موقعہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے (جو صدیوں کی مدت میں کسی قوم کو مل سکتا ہے اور مخصوص سیاسی و بین الاقوامی حالات کی بنا پر ہندوستان کی ملت اسلامیہ کو حاصل ہوا تھا۔) جن وسیع صلاحیتوں اور خصوصیتوں کے اشخاص درکار تھے، اُن کے انتخاب پر مناسب توجہ نہیں کی گئی اور ان کی تربیت اور تیاری کے لئے مناسب اور ضروری وقت نہ مل سکا۔ اور نہ اُس کو ضروری سمجھا گیا، مشرقی اسلامی ممالک میں جو مغربی نظام تعلیم عرصہ سے رائج تھا اور مغربی تعلیمی مرکز جہاں اُن لوگوں نے تعلیم حاصل کی تھی، (جن کی تقدیر میں اس نئی اسلامی ریاست کی تشکیل اور رہنمائی کا نازک کام آیا تھا۔) اس سے بہتر نمونہ

---

[1] نوائے وقت ۸ جنوری ۱۹۵۰ء

پیش کرنے سے قاصر رہے جو ہمیں پاکستان کی موجودہ شکل میں نظر آتا ہے، وہ اس طرز فکر اور طرز حیات کے سوا دنیا کو کچھ اور نہیں دے سکتے تھے، اور جس طرح درخت کو اس کے قدرتی پھل پر ملامت نہیں کی جا سکتی، اس نظام تعلیم، اس کے مغربی رہنماؤں اور اس ذہنی ماحول سے شکایت بیجا ہے کہ اس نے اس نوزائیدہ اسلامی ریاست کے لئے ایسے رہنما اور سربراہ مہیا نہیں کئے جن کو دین کی ابدیت و کاملیت اور اس کی لافانی صلاحیت پر غیر متزلزل یقین ہو اور اسکی توسیع و تبلیغ کے لئے ان کے اندر قرون اولیٰ کا سا جوش پایا جاتا ہو، جو مغرب کے افکار و اقدار کے سامنے سپر ڈالنے کی بجائے اور اپنے ملک کے قانون و نظام کو ان کے سانچے میں ڈھالنے کی بجائے مغربی تہذیب کے صالح اجزاء اور وسائل و علوم جدیدہ کے آہن کو اپنے یقین کی گرمی سے پگھلا کر اپنی تہذیب کے سانچہ میں ڈھالیں اور اپنی ضرورت، اور اپنے ڈھب کے سانچے تیار کرلیں۔

افسوس ہے کہ ایجابی اور مثبت طور پر قیام پاکستان کی معتدبہ مدت میں بھی نظام تعلیم کو (جو کسی ملک کو کسی خاص رخ پر لے چلنے کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔) اسلامی روح اور اسلامی مقاصد کے لئے از سر نو ترتیب دینے۔ پاکستانی معاشرہ کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے، آئین کو اسلامی بنانے، ذہنی انتشار اور اخلاقی فساد کے معلوم و معروف ناکوں اور سرچشموں کو بند کرنے کے لئے کوئی جرأت مندانہ اقدام نہیں اٹھایا گیا، اور کسی طرح اس کا ثبوت دینے کی مخلصانہ سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی کہ پاکستان ایک نیا اسلامی معمل اور تجربہ گاہ ہے۔ جہاں اسلامی طریق زندگی کی افادیت، اسلامی اصول و قوانین کی صلاحیت اور اسلامی تہذیب کی فوقیت کا عملی ثبوت فراہم کیا جائے گا۔ اور دوسرے ابھرتے ہوئے ممالک کے لئے عملی مثال پیش کی جائے گی، اس کے برخلاف عائلی قانون (MUSLIM FAMILY LAWS) ۱۹۶۱ء نے یہ ثابت کر دیا کہ پاکستان کے آئین ساز اور سربراہ مغربی افکار و اقدار سے نہ صرف پوری طرح متاثر ہیں بلکہ ان کو آئین سازی کے لئے فیصلہ کن بنیاد سمجھتے ہیں اور شریعت کی کاملیت اور ابدیت پر ان کو یقین نہیں۔

بالآخر نومبر ۱۹۶۳ء میں قومی اسمبلی نے اپنے ڈھاکہ کے اجلاس میں اس عائلی قانون کو منظور اور ان تمام ترمیمات کو جو اس بنیاد پر تھیں کہ یہ قانون قرآن و سنت کے نصوص و تصریحات اور اجماع و تعامل کے خلاف ہے، مسترد کر دیا۔ اور لوگوں نے تعجب کے ساتھ پاکستان اور ہندوستان کے اخبارات میں یہ خبر پڑھی:-

"یہاں قومی اسمبلی نے کل بڑی اکثریت سے "عائلی قانون" میں ترمیم کی کوشش کو

رد کر دیا، اس کی بعض دفعات میں ترمیم کا بل ایوان کے سامنے آیا تھا۔ مارشل لا، کے زمانہ میں نافذ شدہ یہ عائلی قانون مردوں کے ایک سے زیادہ شادی کرنے کے آزادانہ اختیار کو منسوخ کر چکا ہے، ترمیم کے موافقوں نے اس بات کا دعویٰ کیا تھا کہ یہ قانون شریعت اور قرآن شریف کے خلاف ہے، جس میں تعدد ازدواج کی کھلی اجازت دی گئی ہے۔ پاکستان کے روشن خیال طبقہ کا کہنا ہے کہ یہ اجازت وقتی اور ہنگامی تھی، اور اس کا مقصد سماج میں تدریجی اصلاح کرنا تھا۔"

اسلام کے منصوص[1] و اجماعی[2] مسائل کے بارہ میں جب پاکستان کا یہ رویہ ہے تو تہذیب و معاشرت، تعلیم و تربیت، سیاست و آئین کے بارہ میں بلند توقعات قائم نہیں کی جا سکتیں، درحقیقت اکثر نئے آزاد یا قائم ہونے والے اسلامی ممالک ترکی کے نقشِ قدم پر سرگرم سفر یا آمادۂ سفر ہیں، اور اُن کے سربراہوں میں (اُن کی مغربی تعلیم و تربیت کے اثر سے) اتاترک کی تقلید کا کم و بیش شوق پایا جاتا ہے۔

بہرحال پاکستان کا اپنے بنیادی مقاصد سے انحراف اور عصر حاضر کی دوسری نامذہبی (SECULAR) اور تجدد پسند (MODERNIST) حکومتوں کی تقلید تاریخ جدید کا ایک عظیم سانحہ ہوگا اور اُن کروڑوں افراد کے ساتھ بے وفائی جنہوں نے اس اسلامی معمل اور تجربہ گاہ کے قیام کے لئے شدید ترین تکالیف برداشت کیں اور عظیم قربانی پیش کی، اس سے بڑھ کر اس کا نقصان یہ ہوگا کہ یہ طرزِ عمل ہمیشہ کے لئے اس اُمنگ اور آرزو کو سرد کر دے گا، اور اس تجربہ کی کامیابی کے امکان کو اگر ختم نہیں تو نہایت بعید بنا دے گا۔ اور بے لاگ تاریخ اور انسانی تجربہ اس کی اجازت بھی نہیں دے گا کہ پھر اس کا نام لیا جائے، پاکستان کی اس نازک اخلاقی ذمہ داری کو پروفیسر اسمتھ (WILFRED CANTWELL SMITH) نے بڑے اچھے انداز سے بیان کیا ہے، وہ اپنی کتاب (ISLAM IN MODERN HISTORY) میں لکھتے ہیں :-

"—— شاید پاکستانی کسی وقت یہ خیال کریں کہ اسلامی معاشرہ کی تعمیر کا کام اُن کے ابتدائی اندازہ سے کہیں زیادہ دشوار طلب ہے۔ لیکن سوچا جائے تو اب اُن کیلئے کوئی راہ مفر باقی نہیں، اُن کے وعدے اور دعوے اتنے بلند بانگ اور واضح تھے

---

[1] جن کے لئے قرآن مجید میں نصِ صریح موجود ہے، مثلاً قانونِ میراث، مرد کے لئے طلاق دینے کی آزادی، تعدد ازدواج وغیرہ۔ [2] جن پر ساری امت کا اتفاق ہے۔

باقی ص۵۷ پر

اسلامی فرقوں میں حق و باطل پہچاننے کا معیار

فرقہ ناجیہ اور نواصب میں فرق

از افادات حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

ترجمہ از مولانا عبدالحمید صاحب سواتی مہتمم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

مکتوب دوازدہم | اس مکتوب میں واضح دلائل مہیا کئے گئے ہیں۔ اس بات پر کہ فرقہ ناجیہ (اللہ تعالیٰ کے نزدیک نجات حاصل کرنے والا گروہ) کون سا ہے۔ امام ولی اللہؒ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور انبیا علیہم السلام پر درود و سلام کے بعد فرماتے ہیں، کہ ایک دن میرے ایک فاضل عزیز نے ذکر کیا کہ ایک بندہ کو اللہ تعالےٰ نے مشرف باسلام ہونے کی توفیق عطا فرمائی اسے فکر دامنگیر ہوئی کہ اسلام کے احکام و مسائل کی تعلیم حاصل کرے، اسی اثنا میں اہل تشیع میں سے ایک شخص اس سے ملا، اور اس نے کہا کہ اسلام کے بہت سے طریقے ہیں۔ (یعنی مسلمانوں کے بہت سے مختلف فرقے ہیں) اور ان میں سے زیادہ صحیح اور صائب طریقہ شیعہ امامیہ کا ہے۔ (اماموں کو معصوم اور مفترض الطاعۃ ماننے والا فرقہ امامیہ کہلاتا ہے۔) کیونکہ ان کا مدار اہل بیت کے اتباع پر ہے اور گھر والا خود اس سے زیادہ واقف ہوتا ہے، جو کچھ گھر میں ہو (اہل البیت ادری بما فیہ) یعنی اہل بیت رسول سب سے زیادہ حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دین اور شریعت کو اخذ کرنے والے اور جاننے والے ہیں۔ اہل بیت ہونے کی وجہ سے۔ لہٰذا تم متعصب نواصب (شیعہ لوگ اہل سنت کو اہل بیت کا مخالف کہتے ہیں۔ اور ناصبی کا لقب دیتے ہیں) سے ہوشیار رہو، کہیں وہ تمہیں گمراہ نہ کر دیں۔ اور تم آؤ تاکہ امامیہ کے طریقہ پر تمہیں اسلامی مسائل کی تعلیم دی جائے۔ امام ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد اس شخص کی ملاقات اس فاضل عزیز سے ہوئی۔ اور اس نے ساری بات سنائی، تو اس عزیز نے کہا کہ مسلمانوں کے فرقوں میں سے امامیہ تو بدترین فرقہ ہے۔ خبردار کہیں تجھے گمراہ نہ کر دیں۔ تم ہمارے پاس آؤ۔ تاکہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے طریقہ کے مطابق

(یعنی حنفی طریقہ کے مطابق) تمہیں اسلامی مسائل کی تعلیم دیں۔ وہ نومسلم مشکل میں پھنس گیا۔ کہ کس طریقہ کو اختیار کرے۔ اور کچھ عرصہ اسی کشمکش میں مبتلا رہا۔ کیونکہ ہر ایک اپنی طرف کھینچتا تھا، آخر اس فاضل عزیز نے اس نومسلم کو ایک تدبیر بتائی۔ اور یہ کہا کہ تم جامع مسجد چلے جاؤ۔ اور جب ہزاروں آدمی وہاں مجتمع ہوں، تو سب کے سامنے برملا دونوں مذہبوں کی بات پیش کر دو۔ اور پھر دیکھو لوگ کثرت سے کس مذہب کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور کون ان میں سے اپنے عقیدہ کے برملا اظہار سے خائف و ہراساں یا خوفزدہ رہتا ہے۔ تم دیکھو اور سوادِ اعظم کا اتباع کرو۔ اس عزیز فاضل کی اس تدبیر سے وہ نومسلم اس مشکل سے نکلا۔ اور اہل سنت والجماعت کے پاکیزہ مسلک میں داخل ہو گیا۔ امام ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے متصل خواجہ محمد امینؒ (حضرت شاہ ولی اللہؒ کے شاگردوں میں سے ایک مایۂ ناز شاگرد تھے۔) کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا، کہ اس فاضل نے جو تدبیر بتلائی اور اس پہ اعتماد کیا یہ ایک خطابی اور شعری (جس کو خطباء اور شعراء محض جذبات کی تسکین کے لئے اپنے خطابوں اور شعروں میں پیش کر دیتے ہیں اور اس قسم کی باتیں کوئی دلائل اور براہین کا درجہ نہیں رکھتیں۔) درجہ کی بات تھی۔ کیونکہ فرض کرو یہ بات ایران کے ملک میں واقع ہوتی جہاں کی اکثریت اہل تشیع پہ مشتمل ہے۔ تو کیا وہاں سوادِ اعظم وہ ہو جاتے۔

علاوہ ازیں بہت سی بدعات جن پہ تمام لوگ عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اور انہیں بنظرِ استحسان دیکھتے ہیں تو کیا اس پہ بھی سوادِ اعظم کا اطلاق ہو گا۔ اس کے بعد خواجہ محمد امینؒ کے دل میں یہ بات پیدا ہوتی، کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور لطف کا تقاضا تو یہ ہے۔ کہ اس مسئلہ میں بھی کوئی حجت قاطعہ ضرور ہو گی، جس میں شکوک اور شبہات کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ اور جو شخص اس حجت کو پائے وہ ہدایت یافتہ ہو گا۔ اور اگر اس حجت کے واضح ہونے کے بعد نفس اور شیطان مانع ہو جائیں تو وہ انسان ہلاک ہو گا۔ اس کے بعد خواجہ محمد امینؒ کے دل میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہو گیا۔ کہ وہ دلیل اور حجت کونسی ہو گی۔ اس کا تعین ہونا چاہیے۔ امام ولی اللہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے مجھ سے اس کا ذکر کیا کہ وہ دلیل ظاہر ہونی چاہیے، تو میں نے کہا کہ اس مسئلہ میں اور تمام مسائل میں جن پر شرعی احکام موقوف ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی کا تقاضا یہ ہوا ہے، کہ اس نے جو علوم لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں اور سینوں میں محفوظ ہوتے ہیں ان سے وہ حجت قاطعہ قائم فرمائی ہے۔ اگرچہ بعض افراد میں ان علوم محزونہ کی تنقیح و ترتیب میسر نہیں ہوتی۔ اور بعض افراد میں ہوائے نفس یا رسوم کے ساتھ الفت مانع ہوتی ہے۔ اس حجت قاطعہ کے اتباع سے۔ لیکن بہرحال اس حجت قاطعہ کی تصدیق ضرور حاصل ہوتی ہے۔

شریعت غرا کی حقانیت کی قطعی تصدیق حاصل ہونے کے بعد اور قرآن کریم کے احکام کے سامنے گردن خم کر دینے اور رحمت دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو مضبوط طریقہ پر پکڑ لینے کے بعد سب سے پہلی چیز جسکو عقل اپنے اوپر ضروری قرار دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ :۔

۱۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو تلاش کیا جائے۔ جو احکام الٰہی کے سلسلہ میں وارد ہوئے ہیں۔ اور پھر ان ارشادات (اخبار و احادیث) کی دل و جان سے تصدیق کی جائے۔ اور اعضاء و جوارح سے اُن کی پیروی کی جائے۔ کیونکہ ہمارا کلام اُس شخص کے بارہ میں ہے۔ کہ جس نے تصدیق کی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مکلف بنایا ہے۔ اور اُس نے مصمم قصد فرمایا ہے کہ وہ اس تکلیف سے عہدہ برآ ہوں۔ اب جس چیز کو ہم نے مخبر صادق کی زبان سے تو نہیں سنا اور نہ اپنی آنکھوں سے خارج میں اس کو دیکھا ہے۔ تو اس کے بارہ میں علم حاصل کرنے کا راستہ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ کہ ثقہ راویوں کی روایت کو ترجیح دی جائے۔ (یعنی ثقہ راوی جو روایات اس مخبرِ صادق سے بیان کریں، اُن کی تصدیق کی جائے۔)

۲۔ دوسری چیز جسکو عقل اپنے اوپر لازم قرار دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ مختلف ارباب مذاہب و ملل کی اخبار اپنے ائمہ اور پیشواؤں سے دو قسم کی ہوا کرتی ہیں۔

ا۔ صاحب ملت کے الفاظ کو بعینہ نقل کرنا۔ اور یہ نقل یا تو خبر متواتر سے ہوگی۔ (جس کو نقل کرنے والے ہر دور اور طبقہ میں اتنے لوگ ہوں جن کے جھوٹ پہ مجتمع ہونے کو عقل محال خیال کرے) یا اسکی نقل خبر مستفیض و مشہور کے ساتھ ہوگی۔ (جسکا درجہ تواتر سے کم ہوتا ہے) یا خبر صحیح سے ہوگی (جس کے نقل کرنے والے راوی عادل اور تام ضبط والے ہوتے ہیں۔) یا حسن (جو صحیح سے کم درجہ کی ہوتی ہے۔) یا غریب (جسکو نقل کرنے والا ایک ہی راوی ہوتا ہے) یا ضعیف سے (جس میں مذکورۃ الصدر شرائط مفقود ہوں) اور عقل لفظی اخبار کو ان ہی قسموں میں منحصر مانتی ہے۔

ب۔ دوسری قسم نقل یا روایت بالمعنیٰ ہے۔ اور یہ بھی کئی قسم ہے۔ ا۔ اس ملت کے تمام فرقوں کا اس پر اجماع ہو کہ یہ صاحب ملت کا دین ہے۔ اور یہ اسی سے لیا گیا ہے۔ اور اکثر کا اتفاق اس پر اسطرح واقع ہو کہ اس مسئلہ کا مخالف شاذ و نادر، جھوٹا، اور غیر معتبر سمجھا جائے۔

حل وعقد اور معاملات کی بست وکشاد میں اُس جماعت کا اعتبار ہوگا جو کہ شریعت کی حفاظت اور نگرانی کرنے پہ قائم ہو۔ اور ورع اور اجتہاد کے ساتھ موصوف ہو۔ اور اس ملت کو ماننے والوں کے نزدیک پیشوا اور مقتدا ہو۔ ایسے لوگوں کا کچھ اعتبار نہ

ہوگا۔ جو نہ دین کی فہم میں حصہ رکھتے ہیں۔ اور نہ اُن کی سعی و کوشش حفاظتِ شریعت کے لئے مصروف ہو۔ اور نہ ان سے دین و شریعت میں علمی تبحر معلوم ہو۔ اور نہ ملّت والے لوگ ان کو پیشوا اور مقتدا بناتے ہوں۔ پس ایسی جماعت کا قول اس سے بہت پست اور حقیر ہے۔ کہ اس سے حل وعقد میں اسکی کوئی تاثیر ہو۔

ب۔۔۔ نقل بالمعنی کی دوسری قسم ایسی خبر ہے۔ کہ ملّت کے مختلف فرقوں کا اس میں اختلاف واقع ہوا ہو۔ اور اس میں دو تین قول واقع ہوگئے ہوں۔ اور ہر ایک فرقہ اپنے لئے روایات سے دلائل پیش کرتا ہو۔ پس جو خبر متواتر یا مشہور ہوگی، اور تمام حاملین ملّت اس پر متفق ہوں یا اکثر اس پر متفق ہوں۔ تو ایسی اخبار اعلیٰ درجہ کی مانی جائے گی۔ گویا کہ ایسی اخبار کا ثبوت صاحب ملّت کیطرف سے ایسا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کیطرف سے اس پر قائم رہنے کی حجت قائم ہوگی۔ چنانچہ اسی قاعدہ سے یہ تخریج کر لینا چاہئے کہ قرآن کریم، اصول عبادات و معاملات، عقائد وغیرہ یہ سب قطعی اور یقینی ہیں۔ ان کے قطعی اور یقینی ہونے کی حجت قائم ہے۔ اور یہی چیزیں اخبار شرع کے امہات اُصول میں ہیں۔ جن سے صرفِ نظر کرنا کسی طرح درست نہ ہوگا۔ اور ان کے مقتضاء پر عمل کرنا واجب ہوگا۔

۳۔ تیسری بات ۔۔۔ عقل اس بات کو پہچانتی ہے۔ کہ ملّتِ اسلامیہ کے مختلف فرقوں کا باہم اختلاف ایسا ہی ہے۔ جیساکہ تمام ملل و مذاہب کے فرقوں میں باہم دگر اختلاف ہوتا ہے۔ اور یہ اختلاف دو قسم کا ہے۔

و۔ ایک اختلاف فرقِ نوابت (خود رو فرقوں) کا جمہور حاملین ملّت کے ساتھ، اور یہ اختلاف یا تو احکام کے استنباط میں ہوگا۔ یا نصوص شرعیہ کے آپس میں تطبیق کے سلسلہ میں ہوگا۔ عقل اس سلسلہ میں ہر ایک کے لئے جدا جدا حکم کرتی ہے، اور ہر ایک کو جدا جدا علامت سے پہچانتی ہے۔ اور اس چیز کو عقل نابت (خود رو) اور غیر نابت (حاملینِ ملّت) کی حقیقت سے ہی انتزاع کرتی ہے۔ اسکی تفصیل یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبران اولوالعزم یعنی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو صرف اس لئے بھیجا ہے۔ کہ اپنا امر اور حکم ان کی زبانوں سے شائع کرا دے۔ اور پھیلا دے۔ اور ان انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں کسی طرح کوتاہی اور تقصیر نہیں کی اور قطعی اور یقینی طور پر شرائع اور احکام کی حقیقت کی تبلیغ کی ہے۔ اور نہ شہرت اور اشاعت کے طریق پر اخفاء اور کتمان کے طریق پر تبلیغ نہیں کی۔ اور ان کے سامعین نے بھی ان معانی کی حقیقت کو پوری طرح ادراک کیا ہے۔ اور اگر وہ سامعین ادراک نہ کرتے تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام

خبردار ہوتے، اور ان کی غلطی پر ان کو متنبہ کرتے۔ پس یہ احتمال پیدا کرنا کہ شاید انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام (شارع) نے بہت سی چیزیں جن کا تعلق شریعت کے ساتھ ہے، عوام تک نہ پہنچائی ہوں، یا پہنچائی ہوں۔ لیکن سامعین نے ان کے سمجھنے میں غلطی کی ہو۔ اور شارع علیہ السلام کو ان کی غلطی کی اطلاع ہی نہ ہوئی ہو۔ یا اطلاع ہوئی ہو۔ لیکن آپ نے اس پر سکوت اور خاموشی اختیار کی ہو۔ یہ بات منصب رسالت پر نظر کرنے سے اور اللہ تعالیٰ کے قصد و ارادہ پر نظر کرنے سے (حق سبحانہ وتعالیٰ کا قصد و ارادہ اپنے دین کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زبانوں سے ظاہر کرنا اور ان کے ذریعہ غالب کرنا ہے۔) یہ احتمال و اعتراض خود بخود ہی کمزور اور مضمحل ہو جاتا ہے۔ پس یہاں سے یہ بات لازم آتی ہے۔ کہ حاملین ملت کا طبقہ اولیٰ جو کہ صحابہؓ و تابعینؒ ہیں، ان کو اپنا پیشوا اور مقتدا بنانا چاہیے۔ اور یہ بات جان لینی چاہیے، کہ وہ مقدار جس کی تبلیغ مقصود و مطلوب تھی اس کا انہوں نے اچھی طرح ادراک کیا تھا۔ اور اس میں کسی قسم کی غلطی نے راہ نہیں پائی۔

ان پہلے طبقات کے بعد ایسی جماعتیں پیدا ہوئیں کہ جن کی ہمت اور قصد صرف یہی تھا۔ کہ شارع علیہ السلام سے نصوص اخذ کریں جس معتمد طریق پر بھی حاصل ہوں۔ اور شریعت اور نصوص کے معانی ہر صحابی سے اور تابعی سے اخذ کریں۔ جو دین کی حفاظت کی سیرت اور ورع اور روایت کے ساتھ مشہور ہوئے ہیں۔ اور انہوں نے طبقہ اولیٰ کو اپنا پیشوا بنا لیا ہے۔ اور اپنے اوپر ان کی فضیلت کے قائل ہوئے ہیں۔ شرائع کی معرفت میں ایسے لوگ حاملین علم ہیں، نوابت نہیں۔

اور اگر ان کا نظریہ یہ ہو کہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بہت سے مطلوبہ احکام ان لوگوں تک پہنچائے ہی نہیں، یا تبلیغ تو کی تھی، لیکن وہ لوگ سمجھے نہیں، یا سمجھے تھے لیکن ان کو انہوں نے چھپا دیا، اظہار نہیں کیا۔ یا یہ کہیں کہ ان کی اکثریت غلطی اور خطا پر جمع ہو گئی۔ یا صرف ایک طریق سے ہی روایت قبول کریں۔ یا کوئی ایسی نئی بات (بدعت وغیرہ) پیدا کریں جس سے پہلے طبقے کے لوگ بے خبر تھے۔ یا یہ کہیں کہ وہ لوگ شارع علیہ السلام کی نصوص کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے۔ اور ہم اس کو سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ نوابت ہیں۔ پس ان نوابت نے طبقہ اولیٰ کے ساتھ جن چیزوں میں اختلاف کیا ہے۔ اور ان کو جھوٹ کے ساتھ یا جہل کے ساتھ کیا ہے۔ ایسے لوگ قابل رد اور لائق تشنیع ہیں۔ اور ان کا اختلاف یقیناً پھینک دینے اور رد کرنے کے لائق ہے۔

حاملین ملت کا باہمی اختلاف | باقی رہا حاملین ملت کا بعض نصوص کی تطبیق میں بعض کیساتھ اختلاف یا استنباط اور اجتہاد کے مختلف ہونے کی وجہ سے باہم اختلاف، بشرطیکہ یہ اختلاف

تاویل بعید نہ ہو۔ اور طبع سلیم اس اختلاف سے اباء نہ کرے تو یہ اختلاف مقبول ہے۔

۴۔ چوتھی بات ـــــ عقل تسلیم کرتی ہے کہ شیعہ نوابت (خودرو) ہیں۔ اور اہل سنت حاملین دین ہیں۔ اور عقل سلیم کا حکم یہ ہے کہ اہل سنت کے ساتھ شیعہ کا جو اختلاف ہے۔ اس میں شیعہ کے اقوال قابل ترک ہیں۔ باقی یہ کہ علماء اہل سنت کا باہم جو اختلاف بعد میں پیدا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں حکم یہ ہے، کہ ہر ایک کو اس بارہ میں معذور خیال کیا جائے۔ اور ان علماء کے اختلاف میں جو چیز اشبہ بالاصول (اصول دین سے زیادہ مشابہت رکھنے والی) ہو۔ اور صاحب شریعت کی نصوص سے زیادہ اقرب ہو۔ اور کبرائے طبقۂ اولیٰ کے زیادہ قریب ہو۔ اس کو اختیار کر لینا چاہیئے۔ اور شیعہ کو ہم نے نوابت کہا ہے تو اسکی وجہ یہ ہے کہ ان کا مذہب اس بات پر مبنی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر وقت ایک امام پیدا ہوتا ہے جسکی اطاعت فرض ہوتی ہے۔ اور وہ معصوم ہوتا ہے۔ اس پر وحی ہوتی ہے۔ اور اس پر ایمان لانا فرض ہوتا ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپؐ کے سوا کوئی بھی مفروض الطاعۃ نہ تھا۔ پس انہوں نے ایسے عقیدہ کو گھڑا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھا۔ اس لئے یہ لوگ نوابت میں سے ہوئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ شیعہ کہتے ہیں، کہ تمام صحابہ اور تابعین سوائے ایک تھوڑی سی جماعت کے سب کے سب حق پر نہیں تھے۔ اور کسی کی روایت کو بھی قابل اعتماد نہیں خیال کرتے۔ بجز اپنے ائمہ کی روایت کے۔ اور یہ علامت ہے نوابت کی۔ علاوہ اس کے یہ بات بھی ہے، کہ شیعہ قرآن وحدیث کے اتباع کو اس شرط کے ساتھ مشروط قرار دیتے ہیں کہ جسکی طرف صرف ان کے ائمہ ہی رہنمائی کرتے ہوں۔ اور یہ علامت نوابت کی ہے۔

علاوہ ازیں شیعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے دائرہ کو انتہائی درجہ تنگ کر دیا ہے۔ اور یہ کہ کوئی شخص آپؐ کی ہدایت سے ہدایت یافتہ نہیں ہوا بجز اس کے کہ شریعت کے ایک دروازہ سے اندر داخل ہوئے اور دوسرے راستہ سے باہر چلے گئے۔ (کیونکہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت سے بجز چند آدمیوں کے اور کوئی بھی فائدہ نہیں حاصل کر سکا۔ جیساکہ شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے، تو یہ رحمت اور ہدایت کے دائرہ کو تنگ کرنے کے مترادف ہے) اگر اس ہدایت کے دائرہ کو اس قدر تنگ تسلیم کیا جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نے کیا کام کیا۔ اور حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہدایت اور رہنمائی فرمائی۔ اگر یہ بات ہو تو پھر جہنم کے ایک زاویہ سے نکل کر دوسرے زاویہ میں چلے جانے

کو تو ہدایت نہیں کہا جا سکتا۔ یقیناً یہ بات ایک بہتان عظیم ہے۔

معتزلہ بھی نوابت میں سے ہیں | کیونکہ اس گروہ کا حاصل کلام یہ ہے کہ یہ گروہ بہت سے عقائد میں طبقۂ اولیٰ کی خبر کو قبول نہیں کرتا۔ اور جہاں قبول کرتے ہیں تو اسکی ایسی تاویلات بعیدہ کرتے ہیں کہ خبر کو ظاہر سے بالکل پھیر دیتے ہیں۔ (اور نصوص کو اپنے محل سے پھیر دینا بھی نوابت کی علامت ہے۔)

بعض متصوفین بھی نوابت میں سے ہیں | موجودہ زمانے کے بعض متصوفین کے گروہ بھی نوابت میں سے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں نے احکام شرع کو معمولی بات خیال کیا ہے۔ اور ان کو وقعت نہیں دی۔ اور بعض نصوص کو اپنے مقاصد فاسدہ پہ محمول کیا ہے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ اصل مقصد تو اتحاد ہے۔ (اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اتحاد) اور احکام شرع تو ان لوگوں کے لئے ہیں جو قاصر ہیں اور اس درجہ اتحاد تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ لوگ بلاشک نوابت میں سے ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ اگر کوئی شخص اپنے دل کو ان کے عقائد سے جدا کرکے صاحب شریعت کی نصوص اور طبقۂ اولیٰ کی اخبار کو غور سے دیکھے تو ان میں ان کے مقاصد کی بُو تک بھی نہیں پائے گا۔ یقیناً ان کے عقائد باطل ہیں۔ اور بہتان عظیم ہے۔

فرقہ زیدیہ بھی نوابت میں سے ہے | جن کا عقیدہ ہے کہ ہر فاطمی عالم جو تلوار (اقتدار اور طاقت) کے ساتھ خروج کرے اس کا اتباع واجب ہوگا۔ اور اسکی نصرت میں سعی کرنی لازمی اور ضروری ہوگی۔

محدثین یا علماء کا باہمی اختلاف | محدثین اور علماء حدیث جو اپنی ہمتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے تتبع پر لگاتے ہیں جس معتمد اور معتبر طریقہ سے بھی وہ حاصل ہوں۔ اور طبقۂ اولیٰ یعنی صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کی اخبار کی طرف بھی اپنی ہمتوں کو مبذول کرتے ہیں۔ لیکن بالاصالۃ نہیں۔ بلکہ اس حیثیت سے کہ یہ حضورؐ کے کلام کی شرح وتفصیل ہے۔ اس لئے طبقۂ اولیٰ کی آراء خاصہ جو امور ملک وغیرہ کے بارے میں ہیں، جنہوں نے باہم اختلاف کیا ہے۔ اور یہ طبقۂ اولیٰ کے حضرات اس میں بتقاضائے بشریت اور کچھ اختلاف امزجہ کی وجہ سے باہم مختلف ہوئے ہیں ان محدثین نے اس بارہ میں کوئی توجہ نہیں کی۔ کیونکہ مقصد اصلی شریعت کی تفصیل کا معلوم کرنا ہے۔ اور یہ اختلافات وغیرہ ایسے امور سے ہیں کہ ان کو اس سے کچھ خاص تعلق نہیں۔ ان علماء کا باہم اگرچہ بظاہر اختلاف بھی ہوا ہے۔ لیکن فروعات میں اور یہ اختلاف عدم اختلاف کے برابر ہے۔ کیونکہ یہ بظاہر دیکھنے میں اختلاف ہے۔ اور حقیقت میں اتفاق ہے۔ اور یہ جماعت یقیناً حاملین ملت میں

رہے ہے۔

خلفاء راشدین اور صحابہؓ کی روایات میں بہت کم اختلاف ہے باقی ہم نے یہ کہا کہ معتمد طریق پر روایت کرتے ہیں۔ یہ ایک مجمل کلام ہے۔ اسکی تفصیل یہ ہے۔ کہ حضرت عمرؓ موافق مخالف سب کے اتفاق سے عقل تام، ضبط وافر اور حفظ عظیم رکھتے تھے، ورنہ اتنی بڑی خلافت کی تنظیم کیسے ہو سکتی تھی۔ اور حضرت عمرؓ روایت میں اہتمام عظیم رکھتے تھے، منبر پہ بیان کرتے تھے، اور ان کے خطبوں میں جو لوگ حاضر ہوتے تھے، ان میں سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا تھا (یہ تو روایات کے بارہ میں طرز عمل تھا) ان کی خاص آراء کے بارہ میں تسلیم و انکار کا دائرہ وسیع تھا۔ ان کے بعد ان ہی روایات کو ایک جماعت نے حفظ کیا۔ یہاں تک کہ طبقہ محدثین تک یہ محفوظ رہیں۔ اور انہوں نے پھر ان کو کتب میں مدوّن کرکے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔

اس کے بعد ایک اور طریقہ ہم ذکر کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ حضرت علیؓ تمام موافق و مخالف کے اتفاق سے عقل تام، حفظ عظیم اور فہم ثاقب اور ضبط وافر رکھتے تھے۔ اور پھر وہ اپنے ایام خلافت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث برملا بیان فرماتے تھے۔ کسی نے بھی ان پر ان احادیث واخبار کے بارہ میں جرح و قدح نہیں کی۔ بہ خلاف ان کی خاص آراء کے جو جنگ جمل وغیرہ میں انہوں نے ظاہر کیں۔ ان میں تسلیم و انکار کی گنجائش تھی، لیکن احادیث جو انہوں نے بیان کیں ان میں کسی قسم کا نکیر نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ یہ احادیث بھی اسی طرح مدوّن ہوئیں۔ اب حضرت علیؓ کی بیان کردہ روایات کو جب ہم حضرت عمرؓ کی بیان کردہ روایات کے ساتھ موازنہ کرتے دیکھتے ہیں تو بالکل ایک دوسرے کے ساتھ مشابہ پاتے ہیں۔ بہت کم ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اگر کچھ تھوڑا بہت اختلاف ہے بھی تو یہ تعدد روایات کے سلسلہ میں ناگزیر ہوا کرتا ہے۔

اسی طرح جب ہم عبداللہ ابن عباسؓ، عبداللہ ابن عمرؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ اور ابوہریرہؓ، ابوموسیٰؓ، عبداللہ ابن عمرو بن العاصؓ، انسؓ، ابوسعیدؓ، جابرؓ وغیرہم دیگر صحابہؓ کی روایات کے سلسلہ میں دیکھتے ہیں تو وہی حفظ اور ضبط کی پوری پوری کوشش پائی جاتی ہے۔ اور بعض کی روایات کو بعض کے ساتھ ہم منطبق پاتے ہیں۔ اختلاف بہت کم نظر آتا ہے۔

اب جو جماعت ان اخبار کے جمع و تدوین کی کوشش کرتی ہے وہ یقیناً حاملین دین میں سے ہے۔ اور یہ جو کچھ ہم نے بیان کیا نوابت اور حاملین دین کے درمیان فرق و امتیاز کا طریقہ، یہ ان لوگوں کے لئے ہے، جو ملت کے مختلف فرقوں کے احوال کا پوری طرح تتبع اور استقراء کرتے

ہیں۔ ورنہ عوام الناس کا یہ منصب نہیں ان کے لئے تو اتنی بات ہی کافی ہے، کہ کوشش و اجتہاد کے کسی نہ کسی طریق سے اتنی بات معلوم کر لیں جس سے حاملینِ ملت کو نوابت سے ممتاز کر سکیں اور پہچان سکیں۔ تاکہ حاملینِ ملت کا اتباع کر سکیں۔ ان کے ذمہ اتنی بات ضروری ہے۔ یہاں تک کہ ان کا استقراء تام ہو اور چہرہ مقصود سے پردہ ہٹا دیا جائے۔

بس اتنی مقدار وہ علم ہے، جس پہ اللہ تعالیٰ نے تکلیف کا مدار رکھا ہے۔ اور لوگوں کے ذہنوں میں اجمالی طور پہ اس کی اصل کو مرکوز رکھا ہے۔ ہر چند کہ اسکی تفاصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ والحمد للہ اولاً و آخراً ظاہراً و باطناً ۔ (مکتوب شاہ ولی اللہؒ مندرجہ کلمات طیبات صـ۱۱۱ تا ۱۵)

نوٹ :- اس مکتوب شریف کا مطالعہ کرنے سے یہ بات خوب روشن ہو جاتی ہے۔ کہ مودودی صاحب بھی نوابت میں سے ہیں، اس لئے کہ ان کی کتابوں اور تحریروں میں ایسے مسائل پائے جاتے ہیں، جو نوابت کی علامت ہیں، اور حاملینِ ملت کے خلاف۔ مثلاً مودودی صاحب :-

۱۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارہ میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ کہ وہ فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے رہے،

۲۔ اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی بشری کمزوریوں سے مغلوب ہو کر مومن کے اعلیٰ معیار کو ہر وقت قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔

۳۔ اور حاملینِ ملت کے طبقۂ اولیٰ کو اپنا پیشوا نہیں مانتے، بلکہ ان پر تنقید کو روا سمجھتے ہیں۔

لہٰذا

وہ نوابت میں سے ہیں جس طرح شیعہ

دعوت وعزیمت کے علمبردار

حضرت مجدد الف ثانیؒ

تحصیل علم | آپ نے سب سے پہلے گھر پر قرآن مجید حفظ کیا جس پہ بہت کم وقت خرچ ہوا اکثر کتب درسیہ اور بعض کتب تصوّف اپنے والد بزرگوار اور دوسرے علماء سرہند سے پڑھیں۔ علاوہ ازیں مولانا کمال کشمیری سے فنون کی کتابیں، شیخ یعقوب سے کتب احادیث اور قاضی بھلول بدخشانی سے متفرق کتب پڑھ کر تکمیل علم کی۔ شیخ کو ادب و انشاء میں بے نظیر ملکہ حاصل تھا، جس پہ آپ کی تصنیفات دال ہیں۔ دربار اکبری کے ابوالفضل فیضی کسی کو درخور اعتناء نہ سمجھتے تھے لیکن شیخؒ کے علم وفضل کے معترف تھے۔ ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

تحصیل طریقت | علوم ظاہریہ کی تکمیل کے بعد تصوّف کی طرف متوجہ ہوئے کہ ——— ؎

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما ——— خود تصوّف اور نسبت مع اللہ کو آپکی انتظار تھی۔ اس کوچہ میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے والد بزرگوار سے طریقہ چشتیہ میں بیعت کی اور اس کا سلوک تمام کیا۔ پھر طریقہ قادریہ اخذ کیا اور تعلیم والد بزرگوار سے ہی حاصل کی اور خرقہ خلافت حضرت شاہ سکندر نبیرہ شاہ کمال کیتھلی سے حاصل ہوا۔ المختصر سترہؔ برس کی قلیل عمر میں جامع کمالات ظاہریہ و باطنیہ ہو کر والد بزرگوار کے سامنے ہی کتب درسیہ کی تعلیم اور طریقہ کی تلقین فرمانے لگے۔ انہی دنوں میں سلسلہ کبرویہ کے مشہور بزرگ مولانا یعقوب خرمیؒ سے سلسلہ کبرویہ حاصل کیا۔ ان تمام کمالات کے باوجود سلسلہ نقشبندیہ کی طلب قلب اطہر میں موجزن کیا ہوئی بڑھتے بڑھتے حد عشق کو پہنچ گئی۔ یہاں تک سنہ ۱۰۰۷ھ میں والد محترم نے دار فانی سے کوچ کیا تو بغرض حج بیت اللہ گھر سے نکل کر دہلی پہنچے وہاں ملا حسن کشمیری سے خواجہ محمد باقی باللہؒ کی نسبت معلومات حاصل ہوئیں۔ یہ پہلے بزرگ تھے سلسلہ نقشبندیہ کے جنہوں نے

سرزمین ہند کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا۔ کابل میں ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے اپنے شیخ خواجہ امکنگی کے حکم سے ہندوستان تشریف لائے، دہلی کو اپنا مستقر قرار دیا۔ بڑے باکمال بزرگ تھے۔ صرف ۴۱ سال کی عمر میں ۲۵ جمادی الثانی ۱۰۱۲ھ شنبہ کے دن وفات پائی۔ وفات سے قبل صاحبزادگان کو شیخ مجددؒ کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ اب امید حیات کم ہے، دہلی میں بیرون اجمیری دروازہ مزار مبارک مرجع عام و خاص ہے۔ آپ کے علو مقام کے لئے یہ کافی ہے۔ کہ شیخ مجدد جیسی اولوالعزم شخصیت نے آپ کو اپنا پیر و مرشد بنایا ؎

مقام حضرت خواجہ نہ پوچھو مختصر یہ ہے
کہ وہ تھے مرشدِ برحق مجدد الف ثانی کے

بہر حال آپ کا ذکر سن کر محض ملاقات کی غرض سے تشریف لے گئے۔ قیام و بیعت کا قطعاً ارادہ نہ تھا، خواجہ بھی دیر آشنا تھے۔ لیکن نگاہ اول میں ہی دیکھ کر فرمایا کہ اگر ممکن ہو تو ایک مہینہ یا کم سے کم ایک ہفتہ قیام کریں۔ آپ نے بھی بلا عذر قبول فرمالیا۔ صحبت کا اثر ایسے جلدی ہوا کہ دو دن بعد آپ کی خواہش پر خواجہ نے خلافِ معمول بلا استخارہ بیعت کر لی۔ آپ نے ۲½ ماہ کا قلیل عرصہ قیام کیا۔ اس مختصر مدت میں نسبت نقشبندیہ جو دوسرا نام ہے دوام حضور و آگاہی کا اور جس کی تعبیر حدیثِ پاک میں کانک تراہ سے کی گئی ہے حاصل کر کے وہ کمالات حاصل کئے کہ مالاعین رأت ولا اذن سمعت۔ کا مصداق ہیں۔ اس کے بعد دو مرتبہ سرہند سے دہلی آکر ملاقات کی۔ سب سے پہلی ملاقات میں کامل طریق سے سلسلہ نقشبندیہ کے حصول کی بشارت ملی دوسری مرتبہ خلعت خلافت عطا ہوئی اور خواجہ نے اپنے مخصوص ترین اصحاب کو تعلیم کے لئے آپ کے سپرد کیا۔ تیسری مرتبہ استقبال کو نکلے اپنے حلقہ میں آپ کو سرحلقہ بنا کر بٹھایا، اور مریدین کو حکم دیا کہ شیخ احمد کی موجودگی میں میری طرف کوئی توجہ نہ کرے۔ اس مرتبہ رخصت کرتے ہوئے فرمایا امید حیات بہت کم ہے ضعف بہت معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے صاحبزادگان خواجہ عبید اللہ اور شیر خوار خواجہ عبداللہ کو آپ کے سپرد کر دیا۔

مرشد کی شہادت | خواجہ محمد باقی باللہ شیخ مجددؒ کے متعلق کیا نظریہ رکھتے ہیں؟ تفصیل کا وقت نہیں، مختصراً سنیں۔ "شیخ احمد مردے است از سرہند کثیر العلم و قوی العمل روزے چند فقیر باو نشست و برخاست کرد عجائب بسیار از روزگار اوقات او مشاہدہ نمود بآں ماند کہ چراغے شود کہ عالمہا از و روشن گردد الحمد للہ تعالیٰ احوال کاملہ او مرا یقین پیوستہ[1] "

---

[1] مقامات ربانی ص۱۱

"شیخ احمد آفتاب است کہ مثل ہزار ہا ستارہ ہا درسایہ اوگم اند مثل ایشاں دریں وقت زیر فلک نیست و مثل ایشاں چند کس دریں امت گذشتہ اند و ایشاں دریں وقت از کمل محبوباں اند"

اندازہ فرمائیں مرید تو پیر کی تعریف کیا ہی کرتے ہیں۔ لیکن یہاں پیر جن خیالات کا اظہار کر رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہیں ——— اور آپ نے بھی حق خدمت ادا کیا اور اس سلسلہ میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اپنے پیر زادوں خواجہ عبید اللہ اور خواجہ عبد اللہ کو لکھتے ہیں :

"ایں فقیر از تاسرقدم غرق احسانہائے والد بزرگوار شما است دریں طریق سبق الف بے از ایشاں گرفتہ است و تہجی حروف ایں راہ از ایشاں آموختہ و دولت اندراج النہایہ فی البدایہ ببرکت صحبت ایشاں حاصل کردہ۔ (مکتوب ۲۶۶ دفتر اول حصہ چہارم)" اور مکتوب نمبر ۲۱ دفتر اول حصہ اول میں فرماتے ہیں : "تا آنکہ حق سبحانہ و تعالیٰ بہ محض کرم خویش بخدمت ارشاد پناہی حقائق و معارف آگاہی مؤید الدین الرضی شیخنا و مولٰنا و قبلتنا محمد الباقی قدسنا اللہ تعالیٰ بسرہ رسانید و ایشاں بہ فقیر طریقہ علیہ نقشبندیہ تعلیم فرمودند و توجہ بلیغ بحال ایں مسکین مرعی داشتند۔"

اس عنوان کو ختم کرنے سے قبل دو واقعے ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پہلا یہ کہ خواجہ محمد الباقی نے تیسری مرتبہ مجدد صاحب کو رخصت کرتے ہوئے فرمایا کہ جب میں نے ہندوستان آنے کے لئے استخارہ کیا تو بعد استخارہ معلوم ہوا کہ ایک خوبصورت طوطی میرے ہاتھ پر آکر بیٹھ گیا ہے میں اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں ڈال رہا ہوں اور وہ اپنے منقار سے شکر میرے منہ میں دے رہا ہے۔ اس واقعہ کو میں نے اپنے پیر و مرشد خواجہ امکنگی سے ذکر کیا تو فرمایا کہ طوطی ہندوستان کا جانور ہے۔ وہاں تمہاری تربیت سے ایسا شخص ظاہر ہوگا جس سے ایک جہاں منور ہوگا اور تم کو بھی اس میں حصہ ملے گا۔ خواجہ نے اس تعبیر کا مصداق آپکو قرار دیا۔ دوسرا یہ کہ خواجہ نے اسی موقعہ پر فرمایا کہ میں جب ہندوستان آتے ہوئے سرہند پہنچا تو معلوم ہوا کہ میں ایک قطب کے پڑوس میں اترا ہوں اور اسکا حلیہ مجھے بتایا گیا۔ جتنے درویش مجھے ملے نہ تو اس حلیہ کا ان میں کوئی تھا، اور نہ صفت قطبیت کسی میں تھی میں نے خیال کیا کہ آئندہ اس شہر میں ایسا کوئی صاحب نصیب پیدا ہوگا۔ جب تمہارا حلیہ دیکھا تو وہی تھا جو مجھے دکھلایا گیا تھا اور تم میں صفت قطبیت کی قابلیت بھی معلوم ہوتی ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ظاہری کمالات | حضرت شیخ ظاہری و باطنی کمالات کے جامع تھے۔ تذکروں سے پتہ

چلتا ہے کہ شکل و صورت اللہ نے ایسی دی تھی اور اتنی محبوب کہ ہر دیکھنے والا تبارک اللہ احسن الخالقین کہہ اٹھتا۔ نیز یہ کہ طلب معاش کی فکر آپ کو کبھی دامن گیر نہ ہوئی اور کیوں ہوتی جس ذات اقدس واطہر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو زندہ کرنے کی غرض سے آپ کا وجود باجود بنا تھا۔ اسکو حکم خداوندی تھا وأمر اهلك بالصلاة واصطبر عليها لا نسألك رزقا نحن نرزقك والعاقبة للتقوى (سورۂ طٰہٰ)

جہانگیر بادشاہ آخر میں آپکا غلام بن گیا، لیکن کوئی امداد قبول نہ کی۔ حتیٰ کہ مریدین میں سے کسی کو اس فکر میں مبتلا دیکھتے تو نصیحت فرماتے، چنانچہ مکتوب ۷۵ دفتر دوم حصہ ہفتم بنام مولانا محمد ہاشم خصوصیت سے ہمارے اس دعویٰ کی دلیل ہے ۔۔۔ ارشاد فرماتے ہیں :۔۔۔ بہرحال متوجہ احوال باطن باشند و طفیلی را ضروری دانند و الضرورة تتقدر بقدرہا۔ الخ

امام ابوحنیفہؒ کی عظمت و رفعت اور تقلید کی ضرورت

اس علم و عمل کے باوصف جسکی تعریف آپ کے پیرومرشد نے کی، آپ امام ابوحنیفہؒ کے مقلد تھے، اور کٹر حنفی! ۔ امام ابوحنیفہ کی عظمت و رفعت، ان کے علوم و اجتہاد اور تقویٰ و ورع کے متعلق مکتوبات میں بہت کچھ موجود ہے۔ پہلے ضرورت تقلید کے متعلق سنئیں، مکتوب ۲۷۲ دفتر اول حصہ پنجم میں فرماتے ہیں : "قیاس و اجتہاد اصلی است از اصول شرعیہ کہ ما بتقلید آں ماموریم بخلاف کشف و الہام کہ مارا بتقلید آں امر نہ فرمودند الہام بر غیر حجت نیست و اجتہاد بر مقلد حجت است پس تقلید علماء مجتہدین باید کرد۔"

مسئلہ سماع و استغنا کے متعلق مکتوب ۲۶۶ دفتر اول حصہ چہارم میں فرماتے ہیں : "عمل صوفیہ در حل و حرمت سند نیست ہمیں بس نیست کہ ما ایشاں را معذور داریم و ملامت نکنیم و امر ایشاں را بحق سبحانہ و تعالیٰ مفوض داریم اینجا قول امام ابی حنیفہ و امام ابی یوسف و امام محمد معتبر است نہ عمل ابی بکر شبلی و ابی حسن نوری" سبحان اللہ مسئلہ کی وضاحت کردی اور مقام ادب بھی سمجھا دیا کہ دنیا سے جانے والوں پر ملامت سے کیا فائدہ۔ تلك امة قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم ولا تسئلون عما كانوا يعملون۔ (البقرہ) ۔۔۔ کاش! دور حاضر کے متجددین و نقاد غور سے دیکھیں اور سبق حاصل کریں۔

امام ابوحنیفہ کے متعلق مکتوب ۵۵ دفتر دوم حصہ ہفتم میں فرماتے ہیں : "مثل روح اللہ مثل امام اعظم کوفی است رحمۃ اللہ علیہ کہ ببرکت ورع و تقویٰ و بدولت متابعت سنت درجہ علیا در اجتہاد و استنباط یافتہ است کہ دیگراں در فہم آں عاجز و قاصر اند ۔۔۔۔۔ و فراست امام شافعیؒ بہ کرشمہ از دقت فقاہت او علیہ الرضوان دریافت کہ گفت الفقهاء كلهم عيال ابي حنيفة۔ ۔۔۔۔۔ بے شائبہ تکلف و تعصب گفتہ مے شود کہ نورانیت ایں مذہب حنفی بنظر کشفی در رنگ دریائے عظیم مے نماید

وسائر مذاہب در رنگ حیاض وجداول بنظر مے آیند - الخ

رعایت سنت | اتباع سنت سے جو حصہ وافر آپکو ملا تھا اسکا اندازہ اس سے لگائیں کہ ایک مرتبہ ایک خادم سے رکھی لونگوں میں سے چند دانے لانے کو فرمایا، وہ چھ دانے لائے تو فرمایا کہ ہمارے صوفی کو اب تک یہ بھی پتہ نہ چلا کہ عدد طاق کی رعایت سنت ہے۔ اللہ وتر یحب الوتر۔

مکتوب ۵۴ دفتر دوم حصہ ہفتم میں اتباع سنت کے سات درجے بیان فرما کر آخر میں لکھتے ہیں - "بالجملہ ہر دولتے کہ آمدہ است از برائے انبیاء علیہم السلام آمدہ است سعادت امتاں است کہ بہ طفیل انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات ازاں دولت بہرہ یابند وازالش ایشاں تناول نمانید ے

در قافلہ کہ اوست دانم نرسم

ایں بس کہ رسد ز دور بانگ جرسم

تابع کامل کسے است کہ بایں ہفت درجہ متابعت متحلی شود ------ الخ

دیگر معمولات | کثرت عبادات نوافل اور تلاوت قرآن سے خاص شغف تھا، نماز کے علاوہ بھی کثرت سے تلاوت فرماتے اور حلقہ میں حفاظ سے سننے کے علاوہ جب کوئی اچھا قاری آجاتا تو اس سے بھی سنتے اس شغف کو دیکھ کر جامی مرحوم کا شعر یاد آجاتا ہے ے

مصلحت نیست مرا سیری ازاں آب حیات

ضاعف اللہ بہ کل زمان عطشی !

لنگر خانہ ہر وقت چلتا رہتا، بڑے چھوٹے کی کوئی تمیز نہ تھی، حتیٰ کہ خود بھی وہی چند لقمے تناول فرماتے، دوپہر کا قیلولہ ضرور کرتے۔ رمضان کے روزے کبھی سفر میں بھی قضا نہ فرماتے۔ ادائیگی زکوٰۃ میں انقراض سال کا خیال بالکل نہ فرماتے، بلکہ جب کچھ ہو جاتا ۱/۴۰ علیحدہ کرکے رکھ دیتے اور مستحقین کو دیتے رہتے، غرض ہر جگہ اور ہر مسئلہ میں عزیمت پر عمل تھا۔ پوری زندگی میں رخصت کا نشان نہیں ملتا۔ حقوق العباد کا خاص اہتمام تھا اولاد اور مریدین کی تربیت بیماروں کی تیمارداری اور جنازوں میں شرکت سبھی کا اہتمام فرماتے ------

امر بالمعروف ونہی عن المنکر | اب ہم اس موڑ پر ہیں جہاں سے آپ کی مبارک ومسعود زندگی کا حقیقی کمال سامنے آتا ہے۔ اس مسئلہ میں آپ ماموِر من اللہ کی سی شان رکھتے ہیں، کسی ملامت کا خوف کسی ایذا کا ڈر کوئی خطرہ اور لالچ آپ کے راستہ کو نہ روک سکا۔ آپ کے زمانہ میں مسلمانوں کی حکومت تھی اور عروج پر تھی، عمر مبارک کا ابتدائی حصہ اکبر کے زمانہ میں گذرا جو گویا

لامذہبیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی سلطنت تھی۔ ہندو سے صلح و آشتی تھی اور دین اسلام کے ساتھ مکمل بغض و عناد! تفصیلات کا وقت نہیں اس کو کسی دوسری فرصت پر چھوڑتے ہوئے چند چیزیں عرض کر کے آگے بڑھتا ہوں۔ تاکہ مقام شیخ سمجھنے میں ذرا آسانی ہو، کیونکہ ماحول کو سمجھے بغیر کسی کی حقیقت سامنے نہیں آسکتی۔

لامذہب اکبر کے عہد کی ایک جھلک | اس سلسلہ کی تفصیلات ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ سے ماخوذ ہیں۔ بجائے توحید، صریح شرک! عبادت آفتاب را روزے چہار وقت کہ سحر و شام و نیم روز و نیم شب لازم گرفتند۔ الخ ص ۳۲۲۔ نیز قرار دادند کہ بہ کلمہ لاالٰہ الا اللہ، اکبر خلیفۃ اللہ علانیہ تکلیف نمائید۔ ص ۲۷۳۔ نیز بجائے سلام، مریداں چوں ہمدگر ملاقات بہ کردند یکے اللہ اکبر دیگرے جل جلالہ گویند ص ۳۵۶۔ سود، جوا، شراب کی حلت۔ ربوا، و قمار حلال شد و دیگر محرمات بریں قیاس باید کرد۔ شراب مباح باشد..... در مجالس نوروزی اکثر علماء و صلحاء بلکہ قاضی و مفتی را نیز دروادی قدم نوشی آوردند۔ غسل جنابت۔ فرضیت غسل جنابت مطلقاً ساقط شد۔ داڑھی کی درگت، نوبت بایں جا رسید کہ بادشاہ کو حدیث دکھلائی گئی کہ پسر صحابی متر شش (داڑھی منڈا) در نظر آنحضرتؐ آمد فرمودند کہ اہل بہشت بایں ہیئت خواہند بود۔ ص ۳۰۷ العیاذ باللہ۔ ساردا ایکٹ یا عائلی قوانین۔ جسکی رو سے چچا زاد اور خالو زاد ہمشیرہ سے نکاح منع تھا، نیز ۱۶ سال سے کم عمر لڑکا اور ۱۴ سال سے کم عمر لڑکی نکاح نہیں کر سکتے۔ نیز حضرت عائشہؓ کی عمر بوقت رخصتی یعنی ۹ برس کا بالکل انکار تھا۔ نیز بیشتر از یک نکاح نکنند کیونکہ خدا یکے و زن یکے۔ نیز لڑکی کی عمر کی تحقیق کے لئے باقاعدہ معائنہ ہوتا۔ ص ۲۹۱ پردہ۔ حکماً جوان عورتیں کوچہ و بازار میں چہرہ کھلا رکھیں ص ۲۹۱۔ پرمٹ پر زنا۔ خاص آبادیاں تھیں، یعنی قحبہ خانے۔ ختنہ۔ بارہ سال سے کم عمر میں اسکی اجازت نہیں، پھر لڑکا خود مختار ہے۔ ص ۳۷۶۔ میت۔ ابتدا سر مشرق کیطرف اور پاؤں مغرب کیطرف کر کے دفنانے کا حکم تھا۔ ص ۳۵۷۔ پھر حکم ہوا کہ خام غلہ اور پکی اینٹیں باندھ کر سپرد آب کرد ورنہ مثل چینیاں درخت پر لٹکاؤ۔ کہاں تک لکھیں۔ ع

قیاس کن ز گلستان اکبر بہار او (بہ ترمیم)

اس دین جدید کے جو آڑے آتا قتل کر دیا جاتا۔ اس زمانہ کے شہداء حق کی فہرست بڑی طویل اور درد ناک ہے۔ ان پر خدا کی بے رحمتیں ---!

(باقی آئندہ)

جناب اختر راہی ۔ بی اے

مولانا رحمت اللہ کیرانوی

ایک نذر مجاہد آزادی

ایک عظیم مناظر

سلطان عبدالعزیز خان ترکی کی خواہش اور صدر اعظم خیر الدین پاشا تونسی کی تحریک پر مولانا رحمت اللہ نے عیسائیت پر ایک محققانہ اور مدلل کتاب تالیف کی (پادری فانڈر نے اسلام کے خلاف "میزان الحق" کے نام سے جو زہر اگلا تھا۔ اس کا تریاق "اظہار الحق" میں پیش کیا گیا تھا) یہ کتاب عیسائیت پر اتمام حجت کا درجہ رکھتی ہے۔ ۱۸۹۱ء میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو ٹائمز آف لندن (TIMES OF LONDON) نے لکھا۔ "اگر لوگ یہ کتاب پڑھتے رہے تو دنیا میں عیسائی مذہب کی ترقی رک جائے گی۔"

۱۱ر جنوری ۱۶۱۳ء کو جہانگیر کے عہد میں انگریزوں نے برصغیر میں تجارت کی غرض سے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی۔ مغلوں کی عظیم قوت روبہ زوال تھی اور حالات دن بدن بگڑتے جا رہے تھے۔ اورنگزیب عالمگیر کی جواں ہمتی اور اولوالعزمی نے کچھ مدت سہارا دیا، لیکن اس کی وفات کے بعد وہ تمام برائیاں ظاہر ہو گئیں جن پر عالمگیر کی فتوحات اور دین پسندی کی وجہ سے پردہ پڑا ہوا تھا۔ انگریزوں نے پر پرزے نکالنے شروع کئے اور اٹھارہویں صدی کے نصف اول تک اس قابل ہو گئے کہ دیسی ریاستوں پر حملہ آور ہونے کے خواب دیکھنے لگے۔ چنانچہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ ہوئی اور میر جعفر کی غداری کی بنا پر کمپنی کامیاب ہوئی، اگرچہ میر جعفر بنگال کا صوبیدار مقرر ہوا لیکن وہ "مردہ بدست زندہ" تھا۔ صحیح حکمران "کمپنی بہادر" ہی تھی۔ سلطان ٹیپو نے غیر ملکی سامراج کو روکنے کے لئے جو عظیم منصوبہ بنایا تھا، میر صادق کی بے وفائی اور ملت دشمنی کی وجہ سے خاک میں مل گیا اور سرنگاپٹم میں بہادری سے لڑتا ہوا یہ مجاہد ۴ر مئی ۱۷۹۹ء کو کام آیا۔ اسی سال شاہ زمان والی کابل رنجیت سنگھ

کو پنجاب میں صوبیدار مقرر کیا گیا جس نے خود مختاری کا اعلان کر کے ۱۸۱۸ء میں ملتان فتح کر لیا۔ جہاں مظفر خان عالی ہمتی سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ سکھوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھتے ہوئے سید احمد شہیدؒ نے تحریک مجاہدین کا آغاز کیا اور کچھ عرصہ اس عفریت کو آگے بڑھنے سے روک دیا لیکن تابکے! آخر ۱۸۳۱ء میں مجاہدین کی دردناک شکست کے بعد سکھوں کے قدم مزید مضبوط ہو گئے اور سکھوں کا اقتدار پشاور تک جا محیط ہوا۔ ۱۸۴۳ء میں کمپنی نے سندھ کا الحاق کر لیا اور ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ کو گرفتار کر کے کلکتہ پہنچا دیا گیا اور اودھ "کمپنی بہادر" نے ملحق کر لیا۔ بہادر شاہ ظفر کی سلطنت سمٹ کر لال قلعہ تک محدود ہو گئی تھی۔ ملک کی سیاسی لیڈرشپ انگریزوں کے ہاتھ میں تھی اور بچے کھچے والیانِ ریاست برائے نام حاکمیت کے مالک تھے۔

عیسائیت کا سیلاب | جسمانی فاتح نے روحانی و مذہبی فاتح بننے کی کوشش کی۔ عیسائی پادریوں کا ایک طوفان امڈ آیا۔ دہلی میں پریس لگ گئے۔ رسائل، پمفلٹ اور تبلیغ عیسائیت سے متعلق دوسرا لٹریچر نہایت تیزی سے چھپنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ملک کی مختلف زبانوں میں لٹریچر تیار ہو گیا۔ یہ یلغار انیسویں صدی کے وسط تک انتہا کو پہنچ گئی۔ عیسائی پادری چوراہوں پر کھڑے ہو کر لیکچر دیتے، پمفلٹ تقسیم کرتے اور عوام کو تشکیک و تذبذب کی دلدل میں پھنسا کر بپتسمہ دے لیتے۔ اس طوفان کا مقابلہ مدرسے کی چار دیواری یا مسجد کے محراب سے ممکن نہ تھا بلکہ ایسے مجاہدوں کی ضرورت تھی، جو ان ہی پادریوں کی طرح چیلنج دیتے اور عیسائیت کا تعاقب کرتے۔

پادری فانڈر | ۱۸۵۴ء میں یورپ سے ڈاکٹر کارل فنڈر (جو ایک جرمن مشنری تھا، اور جسے روسی سلطنت نے جورجیا کے شوشا سے بدر کر دیا تھا[1]) فانڈر عربی اور فارسی میں خاصی دستگاہ رکھتا تھا۔ اسلامی ماخذوں کا براہِ راست مطالعہ کر چکا تھا، اور اسلام پر اعتراضات کرتا پھرتا تھا۔ یہاں کے سادہ لوح علماء نے تورات اور انجیل کی طرف زیادہ توجہ نہ دی تھی اور چھان پھٹک نہ کی تھی۔ پادری فانڈر دندناتا رہا تھا۔ اور مشہور ہو گیا کہ پادری فانڈر کے اعتراضات کا جواب دیا ہی نہیں جا سکتا۔

عیسائیوں کی اس بھرپور یلغار اور پادری فانڈر کے پروپیگنڈے کو بے اثر بنانے کے لئے دو دوست میدان میں اترے۔ ایک مولانا رحمت اللہ تھے اور دوسرے ڈاکٹر وزیر خان۔ ان صفحات میں ہم مولانا رحمت اللہ کی زندگی ایک نظر میں دیکھتے ہیں۔

آباؤ اجداد | مولانا رحمت اللہ کے اجداد پانی پت کے رہنے والے تھے۔ لیکن ان کے

---

[1] اہل مسجد پادری بیوان جوبنز ص ۲۱۴

والد مولوی نجیب اللہ ترک وطن کر کے کیرانہ ضلع مظفر نگر میں سکونت پذیر ہو گئے۔ یہیں مولانا جمادی الاولیٰ ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی اور مزید تعلیم کے لئے دہلی کا رخ کیا جو اس دور میں علم و ادب کا مرکز تھا۔ وہاں لال قلعے کے نزدیک مولوی محمد حیات کی درسگاہ میں شامل رہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مولانا احمد علیؒ اور مفتی سعد اللہ لکھنوی سے بھی اکتساب فیض کیا ہے۔[۱]

مطالعہ عیسائیت | قیام دہلی کے دوران میں عیسائی پادریوں کی تبلیغی سرگرمیاں دیکھیں اور مسلمانوں کو اس طوفانِ ضلالت سے بچانے کے لئے کمربستہ ہوئے، اس عرصے میں ڈاکٹر وزیر خان (آگرہ) سے رسم و راہ ہوئی۔ دونوں دوست عیسائیت کے مطالعہ میں غرق رہے اور قلیل مدت میں محنت اور دماغ سوزی سے اس تک استعداد بہم پہنچائی کہ گھنٹوں عیسائیت پر بے تکان گفتگو کرتے رہتے۔ انداز بیان اتنا دلپذیر اور دلکش تھا کہ زبان سے نکلنے والی بات سیدھی دل میں گھر کر جاتی۔

پادری فانڈر سے مناظرہ | فانڈر شہر بہ شہر پھرتا پھراتا آگرہ میں وارد ہوا اور اپنے روایتی انداز میں مناظرہ کا چیلنج دیا۔ ڈاکٹر وزیر خان نے مولانا رحمت اللہ کو کیرانہ سے بلا بھیجا اور مناظرہ کی دعوت قبول کر لی۔ رجب ۱۲۷۰ھ (مارچ ۱۸۵۴ء) کو آگرے میں مناظرے کا انتظام ہو گیا۔ مناظرہ خاصا معرکہ آمیز تھا۔ لہذا دور و نزدیک سے امراء علماء اور عوام کھنچ کر آ گئے۔ دونوں فریق کی طرف سے دو دو مناظر مقرر ہوئے۔ عیسائیوں کی طرف سے مناظر اول پادری فانڈر اور مناظر دوم پادری والپی فرنچ تھا، جو لاہور کا پہلا بشپ مقرر ہوا۔ ادھر سے مناظر اول مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور مناظر دوم ڈاکٹر وزیر خان مقرر ہوئے، ان کے تعاون کے لئے مولانا فیض احمد بدایونی موجود تھے۔[۲]

مفتی انتظام اللہ شہابی اس مناظرے کی روداد بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> "پہلا مسئلہ جس پر بحث ہوئی انجیل و تورات کی تحریف کا تھا۔ بحث و تمحیص کے بعد علانیہ سب کے سامنے پادری فانڈر کو اعلان کرنا پڑا کہ ہماری کتابیں محرف ہو چکی ہیں، لیکن صرف مسئلہ تثلیث میں تحریف نہیں ہوئی۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ جس کتاب کو خود مشکوک مان رہا ہے اس پر ایمان لانے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں الغرض شکست فاش کے ساتھ پادری فانڈر کو مجلس سے اٹھنا پڑا اور وہ آگرہ سے چلتا بنا۔"[۳]

---

[۱] تاریخ افکار حیات ج ۲ ص ۔۔ اور مرقاۃ الیقین [۲] اہل مسجد پادری بیون جونز ص ۔۔ [۳] ۱۸۵۷ء کے مجاہد [۴] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء۔

غرض یہ کہ مولانا رحمت اللہ اور ان کے دستِ راست ڈاکٹر وزیر خان کی کوششوں سے مناظرے کا ذوق اسقدر عام ہوا کہ عیسائی پادری پاؤں نہ جما سکے اور ہر جگہ شکست پر شکست کھاتے رہے۔

جنگِ آزادی | میرٹھ میں جنگِ آزادی کے شعلے بلند ہوئے تو ان کی تپش مظفرنگر میں بھی محسوس کی گئی اور مختلف شہروں اور قصبوں میں حالات دگرگوں ہوگئے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانہ میں مجاہدین کے سالار تھے۔ مجاہدین کیرانہ میں گوجروں کی اکثریت تھی اور ان کی قیادت چوہدری عظیم الدین کر رہے تھے، لیکن تمام احکامات مولانا رحمت اللہ کیطرف سے صادر کئے جاتے تھے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ بجایا جاتا۔ لوگ جوق در جوق تازہ احکامات سننے کے لیے دوڑے آتے۔ پھر اعلان ہوتا " ملک خدا کا حکم مولوی رحمت اللہ کا " اس کے بعد تازہ ترین صورتِ حال کے مطابق احکام جاری کئے جاتے۔ تقریباً چار ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر انگریزی فوج کیرانہ آپہنچی۔ محلہ دربار کے سامنے توپیں گاڑھ دی گئیں اور قصبے بھر کی خانہ تلاشی شروع ہوئی۔ مولانا کو پہلے ہی اطلاع مل گئی تھی چنانچہ وہ اپنے رفیقوں کی معیت میں قریبی گاؤں پنجیٹھ چلے گئے۔ کیرانہ کی خانہ تلاشی کے بیکار جانے کی وجہ سے انگریزی فوج نے پنجیٹھ کا رُخ کیا۔

انگریزی فوج آیا ہی چاہتی تھی کہ گاؤں کے نمبردار نے مولانا کا عالمانہ لباس بدلوا کر گھسیارے کا لباس پہنا دیا۔ ہاتھ میں کھرپا دے کر گھاس کھودنے کے لیے بٹھا دیا۔ مولانا گھاس کھودنے کے بہانے بیٹھے رہے اور ان کے بغل سے انگریزی فوج گھوڑے دوڑاتی ہوئی گزر گئی۔ پنجیٹھ پہنچ کر تلاشی لی گئی۔ مگر گوہرِ مراد نہ ملنا تھا نہ ملا۔ مولانا بچتے بچاتے دہلی آئے۔ مولوی ذکاءاللہ لکھتے ہیں:

> "مولوی رحمت اللہ اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے۔ وہ بڑے عالم فاضل تھے۔ عیسائی مذہب کے رد میں صاحبِ تصنیف تھے۔ وہ قلعے کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اترے۔ اس دانشمند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی۔ بلکہ ایک ہنگامہ فساد برپا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن چلا گیا"[1]

مولوی ذکاءاللہ کے مندرجہ بالا بیان کے خط کشیدہ جملے محلِ نظر ہیں۔ مولانا کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے یہ بیان صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا دہلی میں اس لیئے نہ رہے کہ ان کے مفرور ہونے کی اطلاع دور و نزدیک ہو چکی تھی۔ مولانا کی گرفتاری کے

---

[1] ذکاءاللہ ص۲۵۶

لئے انعام کا اعلان کر دیا گیا۔

مولانا نے اپنا نام بدل کر "مصلح الدین" اختیار کیا۔ خدا معلوم کن راستوں سے ہوتے اور تکالیف برداشت کرتے سورت پہنچے اور وہاں سے جہاز کے ذریعہ مکہ معظمہ چلے گئے۔

جائداد کی ضبطی | مولانا کی ہجرت کے بعد سرکار انگریزی نے جائداد ضبط کر لی۔ اس معاملے میں مخبری کرنے والا کوئی "کمال الدین" تھا۔ ۳۰ جنوری ۱۸۶۴ء کو ان کی قصباتی جائداد نیلام ہوئی اس جائداد میں چھ سرائیں شامل تھیں۔ لاکھوں کی جائداد ایک ہزار چار سو بیس میں نیلام کر دی گئی۔[1]

پادری فانڈر سے ایک اور مناظرہ | پادری فانڈر ۱۸۶۶ء میں ہندوستان چھوڑ کر چلا گیا اور قسطنطنیہ جا بھگدڑ مچائی۔ مولانا رحمت اللہ نے آگرے کے مناظرے میں فانڈر کو بھگایا تھا جسکی شہرت دور و نزدیک پھیل چکی تھی۔ چنانچہ سلطان کے حکم سے مناظرے کے لئے قسطنطنیہ پہنچے۔ فانڈر کو دوبارہ ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ سلطان کی طرف سے مولانا کا تین سو روپیہ ماہوار مقرر ہوا۔[2]

اظہار الحق | سلطان عبدالعزیز خان ترکی کی خواہش اور صدر اعظم خیر الدین پاشا تونسی کی تحریک پر مولانا رحمت اللہ نے عیسائیت پر ایک محققانہ اور مدلل تالیف کی (پادری فانڈر نے اسلام کے خلاف "میزان الحق" کے نام سے جو زہر اگلا تھا۔ اس کا تریاق "اظہار الحق" میں پیش کیا گیا تھا) یہ کتاب عیسائیت پر اتھارٹی کا درجہ رکھتی ہے۔ ۱۸۹۱ء میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو ٹائمز آف لندن (TIMES OF LONDON) نے لکھا:

"اگر لوگ یہ کتاب پڑھتے رہے تو دنیا میں عیسائی مذہب کی ترقی رک جائے گی۔"[3]

مدرسہ صولتیہ | مولانا رحمت اللہ نے قسطنطنیہ سے مراجعت کی تو کلکتہ کی ایک مخیر خاتون صولت النساء بیگم کے تیس ہزار کے عطیے سے ۱۲۹۲ھ میں مکہ معظمہ میں مدرسہ صولتیہ کے نام سے ایک درسگاہ قائم کی جو تاحال جاری ہے۔

مولانا آخری دنوں مدینہ منورہ گئے ہوئے تھے۔ وہیں ۲۲ رمضان ۱۳۰۸ھ (۱۲ مئی ۱۸۹۱ء) کو خدا کا بلاوا آ گیا۔ اور مدینہ کی خاک پاک میں سو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

---

[1] الجمعیۃ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۵۷ء بحوالہ ۱۸۵۷ء کے مجاہد

[2] قاموس المشاہیر ج ۲ صفحہ ۲۵۹-۲۶۰

[3] علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے حصہ اول صفحہ ۳۹

مولانا شبیر علی شاہ صاحب مدرس دارالعلوم حقانیہ

گذشتہ سے پیوستہ

مسجد حرام کی فضاؤں میں

مشاہدات و تاثرات

منیٰ! مکہ مکرمہ سے تین میل دور جانب مشرق کو دو پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع میدان ہے۔ جہاں ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کے لئے پیش فرمایا تھا۔ ابلیس ملعون نے وسوسہ ڈال کر ان کو اس ارادہ سے روکنے کی کوشش کی تو ابراہیم علیہ السلام نے ابلیس کو کنکریاں مار کر بھگایا تھا۔ اب بھی یہی ابراہیمی سنت جاری ہے۔ کنکریاں مارنے کو عربی میں رمی الجمرات کہتے ہیں۔ سورج نکلنے کے بعد ہم عرفات روانہ ہوئے۔ آج پیر کا دن ہے۔ کل بروز منگل یوم النحر (قربانی کا دن) ہے۔ منیٰ سے عرفہ تک موجودہ حکومت نے پانچ سڑکیں تعمیر کی ہیں۔ ہر ایک سڑک پر بسوں، ویگنوں، ٹرکوں اور کاروں کا ہجوم سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ منیٰ سے مزدلفہ جانب مشرق کو تقریباً تین میل اور مزدلفہ سے عرفات بھی اتنی مسافت پر بجانب مشرق واقع ہے۔ گویا منیٰ، مزدلفہ، عرفات تینوں ایک ہی لائن میں واقع ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ ہماری بس سب سے آگے جانیوالی بسوں کی قطار میں منسلک ہے، مگر آگے چل کر معلوم ہوا کہ ہزاروں بسیں آگے نکل چکی ہیں۔ چھ میل کی یہ مسافت تقریباً ایک گھنٹہ میں طے ہوئی۔ مسجد نمرہ پہنچے تو دیکھا کہ وادیٔ عرفات کا وسیع خطہ لاکھوں حجاج سے معمور تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آج کل کے مطوف اپنی سہولت کی خاطر اپنے حجاج کو ۸ ذی الحجہ کو منیٰ میں ٹھہرنے نہیں دیتے، سیدھے عرفات پہنچاتے ہیں۔ کتنی افسوس کی بات ہے کہ مطوفین حضرات اپنی آسانی کے لئے ہزاروں نفوس کو منیٰ میں ٹھہرنے کی سنت عظیمہ سے محروم کر دیتے ہیں۔ مجبوری کا مسئلہ تو الگ ہے کہ انسان عرفہ کی صبح

مکہ پہنچا تو وہ بجائے منیٰ اترنے کے سیدھا عرفات جائے گا۔

جبل رحمت | جبل الرحمۃ (رحمت کی پہاڑی) سے آدھ میل دور ہماری بس رک گئی، اور ازدحام کی وجہ سے بسوں کا آگے جانا مشکل ہو گیا۔ بس سے اتر کر جبل الرحمۃ کی طرف پیدل روانہ ہوئے۔ جبل الرحمت کو جبل الدعاء بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے، اس پر یا اس کے قرب وجوار میں ٹھہرنا افضل ہے۔ خاص کر اس جگہ جہاں بڑے بڑے سیاہ پتھر ہیں۔ یہ جگہ رحمت کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ اگر یہاں جگہ نہ مل سکے تو جہاں بھی ٹھہرنا میسر ہو وہاں ٹھہر جائے مگر عرنہ کے نشیب میں نہ ٹھہرے — ہمیں جبل الرحمت کے ایک گوشہ میں بیٹھنے کی جگہ میسر ہوئی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دریا موجزن ہے۔ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ کا منظر ہے۔ بادلوں کے ٹھنڈے سایہ نے واقفین عرفہ (حجاج) کو معلموں کے سائبانوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ موسم انتہائی خوشگوار ہے — جبل الرحمۃ سے دیکھا تو چاروں طرف خیمے ہی خیمے نظر آئے۔ سائبانوں، بسوں ٹرکوں، کاروں اور انسانوں کی آبادی حد نگاہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ وہ انسانی سمندر جو مسجد الحرام میں بحکم ایزدی سمٹ جاتا ہے، یہاں اپنی شکل میں موجیں مار رہا ہے۔ عرفات کا یہ دن ذکر و اذکار تلبیہ، تلاوت اور دعاؤں میں بسر کرنا چاہئے۔ مناسک حج کا لب لباب، محور اور نچوڑ آج کا دن ہے۔ اس دن خداوند کریم سات آسمانوں کے اوپر سے عرفات کے اس میدان میں جمع ہونے والوں کو محبت کی نگاہوں سے نوازتا ہے۔ اور اپنے ان بندوں پر مباہات اور فخر کے طور پر فرشتوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

هٰؤُلَاءِ عِبَادِي جَاءُوا مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ شُعْثًا غُبْرًا أُشْهِدُكُمْ يَا مَلَائِكَتِي إِنِّي قَدْ غَفَرْتُ لَهُمْ ...	یہ میرے بندے پراگندہ بال غبار آلود حالت میں دور دراز سے میری رضامندی کی طلب میں آئے ہیں۔ اے میرے ملائکہ تمہیں گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے ان کو بخش دیا ہے۔

تسبیح وتہلیل اوراد و وظائف میں یہ لمحات بسر کرنے چاہئیں۔ کوشش کرنی چاہئے کہ ندامت و خجالت کے عالم میں آنسوؤں کے چند ایک قطرے بھی ٹپکیں جو نیک بختی کی علامت ہے۔ اگر رونا نہ آئے تو رونے والے جیسی ہیئت اختیار کر لینی چاہئے۔ عرفات کے اس نورانی بقعہ میں رب العالمین کی شان کریمی کے کرم ہائے بے پایاں اور اسکی رحمتوں کی موسلا دھار بارشیں دید سے تعلق رکھتی ہیں نہ کہ شنید سے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو ان مقدس مقامات کی زیارت

بارہا نصیب فرمادے۔

وادئ عرفات کے وسیع خطہ میں کرۂ ارضی کے ہر گوشہ سے آئے ہوئے لاکھوں انسانوں کی یہ آبادی میدانِ حشر کا نمونہ بتلا رہی ہے۔ یہ مختلف لغات اور بولیاں بولنے والے ایک ہی اللہ سے مانگ رہے ہیں۔ تمام روئے زمین سے جمع ہونے والوں نے ایک ہی وضع قطع کا لباس پہنا ہے۔ طریقۂ عبادت سب کا ایک، مقصد و غایت میں سب مشترک، ہر ایک قرآنی زبان (عربی) بول رہا ہے۔ کسی کو معلم یا معلم کا وکیل (ایجنٹ) دعائیں سکھا رہا ہے۔ کسی کے ہاتھ میں کتاب ہے، کوئی یاد سے مصروفِ دعا ہے۔ پسینہ اور خون کے اعتبار سے ان لوگوں میں ممتاز فرق ہے۔ ان کی زبانیں مختلف، عمریں متفاوت، ثقافت و تہذیب جدا، طرزِ لباس و معیشت میں متفرق، کوئی عربی ہے تو کوئی عجمی، کوئی مشرقی بلاد سے آیا ہے، کوئی مغربی بلاد سے، پاکستانی، افغانی، ہندی، ایرانی، ترکی، عراقی، شامی، مصری، الجزائری، اردنی، یمنی، حجازی، ایشیائی، افریقی۔ غرض ہر ملک اور ہر قوم کے سیاہ و سفید و سرخ و زرد، موٹے پتلے، لمبے قد والے اور چھوٹے قد والے۔ مرد، عورت، بچے بوڑھے، جوان۔ طرح طرح کے انسان یہاں آکر ایک دوسرے کے بھائی بن گئے ہیں۔ ان میں باہمی انس و الفت ہے۔ آپس میں ایک دوسرے کی زبانوں سے ناآشنا، مگر ان کے دلوں میں باہمی محبت اور مروت کے جذبات ہیں جو حرکات و سکنات کے اشاروں سے نمایاں ہیں۔ نہ ان کو اپنے بچے یاد ہیں، نہ گھر والے۔ گھر بار اور وطن سے دور۔ تجارت و ملازمت سے بے فکر ایک ہی خدائے عز و جل کو راضی کرنے کے متلاشی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے آخری نبی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے متمنی۔ انہوں نے ایک ہی لباس پہن کر وطنیت و قومیت کے بتوں کو پاش پاش کر دیا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ۔ (بیشک ایمان والے آپس میں بھائی بھائی ہیں) ایک ہی نہج کے کپڑے، ایک ہی عمل، ایک ہی قول (تکبیر و تہلیل اور تلبیہ) نے ان کو یک جسم و یکجان بنا دیا ہے۔ عرفات کا یہ میدان ہو، یا مزدلفہ کی رات، منیٰ کا ماحول ہو یا مکہ کی آبادی۔ ہر جگہ یہی لباس، یہی عمل اور یہی قول۔ ان لوگوں پر حجت قاطع اور برہان ساطع ہے۔ جو وطنیت و قومیت، نسبیات و عصبیات کی آگ سلگا رہے ہیں اور جاہلیت کے مردہ دور کو دوبارہ زندہ کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔

چاروں طرف واقفین کرام (حجاج) کی تضرع و الحاح۔ آہ و بکا میں ڈوبے ہوئے اذکار و اوراد، استغفار و تلبیہ کا ایک عجیب و دلکش منظر ہے۔ عرفہ کے دن زوال سے قبل غسل کرنا افضل ہے آجکل

پانی کی بہتات ہے۔ جا بجا پانی کے نلکے موجود ہیں۔ مسجد نمرہ میں ظہر کی نماز باجماعت ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ظہر کی نماز کے بعد فوراً امام کے پیچھے عصر کی نماز پڑھ لینی چاہئے۔ عرفہ کے دن عصر کی نماز ظہر کے وقت میں پڑھنا سنت نبوی ہے۔ مگر افسوس کہ ہم بعض کمزور اور بیمار ساتھیوں کی وجہ سے جبل رحمت سے نہ اتر سکے اور ظہر کی نماز اس پہاڑ پر پڑھ لی۔

عصر تک جبل الرحمۃ کی نورانی آغوش میں وقوف کیا۔ نیچے اترے تو چند چھوٹے بچے دیکھے جو حاجیوں کے دلوں کو اپنی پُرسوز اور پیارے کلمات سے موم بنا رہے تھے۔ حاجیوں کے سامنے دست سوال دراز کرکے ِللہ ِللہ۔ حجاج بیت اللہ۔ جیسے مقفیٰ و مسجع کلمات پڑھ رہے تھے۔ سورج غروب ہوا تو حاجیوں کا بابرکت قافلہ "مزدلفہ" روانہ ہوا۔ الحمدللہ کہ وقوف بالعرفہ کا یہ اہم رکن حجاج کرام نے خوشگوار موسم میں ادا کیا۔ اس رکن کے لئے طہارت شرط نہیں حیض و نفاس والی عورتیں بھی وقوف کریں گی۔ راستے میں مسجد نمرہ کے بالمقابل ایک چوک میں شاہ فیصل کا بھائی ٹریفک والے سپاہیوں کے ساتھ کھڑا دیکھا، جو ٹریفک کی خدمات سرانجام دینے میں سپاہیوں کے دوش بدوش مصروف عمل تھا۔ شاہی خاندان کے کئی نوجوان موسم حج میں انتظامی امور کو پوری جانفشانی سے سرانجام دینے کو اپنا فرض اور موجب صد سعادت سمجھتے ہیں۔۔۔ پولیس احرام کے کپڑوں میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف، ڈرائیور احرام کی دو چادروں میں ملبوس، ڈاکٹر وغیرہ عملہ ایام حج ہیں ایک طرف مناسک حج کی ادائیگی میں مصروف نظر آتے ہیں تو دوسرے اوقات میں اپنے مشاغل و مصروفیات میں منہمک، سعودی حکومت کے انتظامات قابل تعریف ہیں۔ عرفات کا یہ میدان جہاں پانی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ آج جگہ جگہ قدم بقدم پانی کے نلکے اور ٹونٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ ہر جگہ پانی کی بہتات ہے۔ گشتی شفاخانے جا بجا کھڑے ہیں۔ گمشدگان کو اپنے اپنے معلموں کے پاس پہنچانے لئے متعدد کمیٹیاں پوری توجہ کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔

پانچوں سڑکیں مشینی قافلوں کی قطاروں سے معمور ہیں۔ اور پیدل جانے والے قافلے کئی فرلانگ کی چوڑائی میں پھیلے ہوئے جا رہے ہیں۔ ان قطاروں کی لمبائی تین میل ہے۔ پہلے نکلنے والے اگر مزدلفہ پہنچ گئے ہیں تو ہزاروں کی تعداد وادی عرفات کی حدود سے اب تک ہجوم کی وجہ سے نہیں نکلے، لاکھوں نفوس کے قدموں کی وجہ سے گرد و غبار کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ عرفات سے مزدلفہ کو پیدل چلنے میں جو لطف محسوس ہو رہا ہے، وہ بسوں اور

کاروں میں جانے سے میسّر نہیں۔ ہر ایک جماعت کا مخصوص نشان ہے۔ تاکہ ساتھی اس نشان کو دیکھ کر اپنی جماعت کو بآسانی پہچان سکے۔ کسی نے لاٹھی کے سر سے لالٹین اٹھا رکھی ہے کسی نے کلہاڑی، کسی نے تلوار، کسی نے سرخ قسم کا جھنڈا۔ کسی نے سیاہ رنگ کا جھنڈا، مختلف رنگ کے جھنڈے اور نشانات نظر آرہے ہیں۔ ان نشانیوں کے باوجود ہزاروں کی تعداد میں ساتھی اپنے ساتھیوں کی تلاش میں ہیں۔ ہم تین ساتھیوں نے تو پہلے سے یہ مشورہ کر لیا ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی ساتھی گم ہوگیا تو وہ ساتھیوں کی تلاش میں اپنے قیمتی وقت کو ضائع نہ کرے۔ ملاقات مکہ مکرمہ میں معلّم کے ہاں ہوگی۔ راستہ میں "رمی الجمرات" کے لئے ستر کنکریاں جمع کر کے احرام کی چادر کے ایک کونے میں باندھ لیں۔

مزدلفہ | مزدلفہ پہنچ کر "مشعر حرام" کے قریب فروکش ہوئے۔ رب العالمین کے جزیل اکرام عطا نے بندوں کو اس خطاب سے نوازا ہے۔

فَإِذَا أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ	جب تم عرفات سے لوٹ کر طواف کیلئے جانے
عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ	لگو تو مشعر حرام کے پاس خدا کو یاد کرو، جیسا کہ تم کو
وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ	طریقہ بتلایا گیا ہے۔ یقیناً تم اس سے پہلے ناواقف تھے۔

مغرب و عشاء کی نمازیں عشاء کے وقت اکٹھی پڑھ لیں۔ مشعر حرام (مزدلفہ) کے پہاڑ پر وقوف (ٹھہرنا) کرنا افضل ہے۔ وادی محسّر کے علاوہ مزدلفہ کی وادی میں جس جگہ بھی قیام کریں جائز ہے۔ حکومت نے وادی محسّر کے دونوں جانب نشاندہی کے بورڈ نصب کئے ہیں، تاکہ اس جگہ میں قیام نہ کیا جاسکے۔ وادی محسّر تقریباً دو فرلانگ طویل ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں "ابرہہ" نے بیت اللہ پر فوج کشی کے ارادہ سے اپنے لشکر کو منظم و مرتب کرنے کے لئے ٹھہرایا تھا۔ یہ جگہ مغضوب و ملعون ہے۔ اصحاب الفیل کے جائے قیام سے بچنے کیلئے شریعت مطہرہ نے ہمیں متنبہ فرمایا ہے۔ مزدلفہ کی یہ رات ذکر و فکر تسبیح و تہلیل، درود و دعا میں بسر کرنی چاہئے۔ یہ رات بعض مشائخ کرام کے نزدیک شب قدر سے بھی افضل ہے۔ تمام رات جاگنے کی طاقت نہ ہو تو رات کے کچھ حصہ میں نوافل و ذکر کی سعادت حاصل کریں۔

صبح کی اذان ہوئی تو "مشعر حرام" میں فجر کی نماز غلس (اندھیرے) میں پڑھ لی۔ نماز کے بعد قبلہ رخ کھڑے ہو کر دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے، خداوند قدوس کے حمد و سپاس، تہلیل و تکبیر اور محسن کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام کے بعد استغفار و دعا مانگنی چاہئے۔ طلوع آفتاب سے قبل منیٰ کو

روانہ ہوئے۔ راستہ میں تلبیہ و تسبیح، ذکر و اذکار کا مشغلہ رہے۔ جب وادیٔ محسر کا نشان آجائے تو وہاں سے قدم تیز کرکے چلنا چاہئے۔ وادیٔ محسر سے آگے منیٰ کی آبادی نظر آئی۔ عقبۃ الاردن کے ایک معمر شخص ابوابراہیم کی زبانی وہ قصیدہ یاد آیا جو اس نے فرطِ جوش میں آکر کہا تھا۔ مگر افسوس کہ ماسوائے دو شعروں کے بقیہ اشعار یاد نہ ہو سکے ؎

يَا رَاحِلِيْنَ اِلٰى مِنًى بِقِيَادِ ۔ هَيَّجْتُمُوْا يَوْمَ الرَّحِيْلِ فُؤَادِيْ
سِرْتُمْ وَسَارَ دَلِيْلُكُمْ يَا وَحْشَتِيْ ۔ فَاَنَا الْاَحِبَّةُ نُحْرَتْ فُؤَادِيْ

منیٰ کی آبادی میں داخل ہوکر "جمرۃ العقبہ" کو کنکریاں مارنے کے لئے روانہ تھے کہ راستے میں محترم قاری محمد امین صاحب (راولپنڈی) کی ملاقات باعثِ انبساط و سرور ہوئی۔ قاری صاحب رمی الجمرات سے فارغ ہوکر قربانی کے لئے "مذبح" (قربان گاہ) جارہے تھے۔ چھ ماہ کی طویل مفارقت کے بعد اپنے علاقہ کے ایک قریبی دوست کی زیارت کیوں موجب صد مسرت و بہجت نہ ہو۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ تفصیلی گفتگو تو بعد میں ہوگی۔ اجمالی طور پر اتنا عرض ہے کہ آج سے ایک ہفتہ قبل دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک گیا تھا، حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ کی زیارت کیلئے۔ وہاں آپ کے والد محترم سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ گھر بار، اعزہ و اقارب سب خیریت سے تھے، البتہ ایک ماہ کے طویل عرصہ میں آپ کے خط نہ پہنچنے کی وجہ سے ان کو انتہائی پریشانی ہے۔ آپ فوراً خط بھیجدیں۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ میں "معلم میر عبداللہ سالم" کے کیمپ میں ہوں۔ یہاں سے مناسک کی ادائیگی کے بعد آپ وہاں آجائیں۔ قاری صاحب "مذبح" کی جانب اور ہم "جمرۃ العقبۃ" کیطرف روانہ ہوئے۔

جمرۃ العقبۃ "جمرۃ العقبۃ" مکہ معظمہ سے آتے ہوئے "منیٰ" میں پہلا جمرہ ہے اور مزدلفہ سے آتے ہوئے آخری جمرہ ہے۔ "یوم النحر" (قربانی کے دن) دس ذی الحجہ کو صرف جمرۂ عقبہ کو کنکریاں مارنے کا حکم ہے۔ جمرۃ العقبہ پہنچے تو بے پناہ مخلوق دیکھی جو کنکریاں مارنے میں مصروف تھی۔ جمرہ کے سامنے چار پانچ گز کے فاصلہ پر کھڑے ہوکر داہنے ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے سروں کے درمیان کنکری پکڑ کر مارنا چاہیے۔ کنکری مارتے وقت بِسْمِ اللّٰهِ اللّٰهُ اَكْبَرُ رَغْمًا لِلشَّيْطٰنِ وَرِضًا لِلرَّحْمٰنِ۔ پڑھنا چاہیئے۔ اس دن کنکریاں مارنے سے قبل دعا کرے اور کنکریاں مارنے کے بعد فوراً واپسی کرے آج یہاں ٹھہرنے کا حکم نہیں۔ ہم نے جب سات کنکریاں ماریں اور واپس ہوئے تو بمشکل ہجوم سے نکلے چپل ہجوم میں رہ گئے، ساتھی گم ہوگئے۔ مگر اللہ تعالیٰ فضل و کرم ہے کہ راستے

میں اپنے ساتھی مل گئے۔

قربان گاہ | اب مذبح کی طرف جانا ہے۔ موجودہ حکومت نے قربان گاہ کیلئے ایک خاص میدان متعین کر دیا ہے۔ پہلے زمانہ میں منیٰ کی ساری وادی قربان گاہ تھی. قربانی کرتے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کو ملحوظ رکھنا چاہیئے، صحابہ کرام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: مَا هٰذِهِ الْاَضَاحِیُّ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ۔ اے رسول خدا ان قربانیوں کی حقیقت کیا ہے ؟ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: سُنَّۃُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاهِیْمَ ۔ یہ تمہارے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے، جبکہ انہوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو خدا کے نام پر ذبح کر رہے ہیں. آنکھ کھلتے ہی حکم خداوندی کی تعمیل کے لئے تیار ہوئے۔ اپنے لخت جگر کو نہلا دھلا کر صاف ستھرے کپڑے پہنا دئے اور اپنے گھر سے نکل کر اس وادیٔ منیٰ میں آئے تھے۔ یہاں پہنچ کر باپ بیٹے کے درمیان یہ لرزہ خیز گفتگو ہوئی تھی، ابراہیم نے کہا:

یَا بُنَیَّ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی ۔	اے میرے پیارے بیٹے! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تجھے خدا کے نام پر ذبح کر رہا ہوں. آپ کا مشورہ کیا ہے۔

...

اسماعیل علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

یَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ مِنَ الصَّابِرِیْنَ ۔	پیارے اباجان! فرمان خداوندی کی فوراً تعمیل کیجئے (یہ میری گردن حاضر ہے) انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنیوالوں میں سے پائیں گے۔

...

باپ اپنے اکلوتے لاڈلے لخت جگر کو منہ کے بل زمین پر لٹا کر تیز چھری حلق پہ پھیرنے لگتا ہے۔ تو شان کریمی کے دریائے ترحم میں جوش آتا ہے اور رب کعبہ آواز دیتا ہے:

یَا اِبْرَاهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۔	اے ابراہیم! آپ نے اپنے خواب کو سچا کر کے دکھایا (آپ نے میرے حکم کی تعمیل کی) یقیناً ہم اپنے مخلص بندوں کو اجر و جزا دیتے ہیں۔

....

جبرئیل امین نے خدا کے حکم سے فوراً ایک دنبہ ابراہیمؑ کی چھری تلے رکھ دیا۔ بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر چھری چلائی، دیکھا تو دنبہ ذبح کیا ہوا ہے۔ جبرئیل امین نے لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر

کے کلمات پڑھے، اسماعیل علیہ السلام نے آنکھ کھولی اور دنبہ کو ذبح شدہ دیکھا تو بے اختیار اللہ اکبر وللہ الحمد کے کلمات کہے۔ اسطرح ابراہیمی قربانی کی ابتدا ہوئی اور رحمت ایزدی نے جگر گوشوں کی قربانی کے بدلے جانوروں کی قربانی لازم کر دی ۔

طغیان ناز ہیں کہ جگر گوشۂ رسول خود زیر تیغ کرد و شہیدش نمے کند

قربانی | اس ابراہیمی سنت پر عمل پیرا ہونے کے لئے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سخت تاکید فرمائی ہے۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے، "کہ جو شخص قربانی کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور اور قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے۔" آپ نے فرمایا: کہ قربانی کا جانور قیامت کے دن اپنے سینگ، بال، کھر، گوشت اور خون سمیت لایا جائیگا، اور اس کا وزن ستر گنا زیادہ کر کے ترازو میں رکھا جائے گا۔ قربانی کے جانور کے خون کا پہلا قطرہ زمین پر گرتے ہی خداوند کریم قربانی کرنے والے کے تمام اگلے گناہ بخش دیتا ہے۔ قربانی کے جانور کے ہر بال کے عوض ایک نیکی نصیب ہوتی ہے۔ حاجی اگر مفرد ہو (صرف حج کی نیت کی ہو) تو اس پر یہاں قربانی لازم نہیں کیونکہ وہ مسافر ہے اور مسافر پر قربانی واجب نہیں۔ ہاں اگر نفلی طور پر کرے تو باعث اجر و برکت ہے ---- البتہ قارن و متمتع پر یہ قربانی بطور شکرانہ واجب ہے۔ (باقی آئندہ)

(بقیہ: مغربی تہذیب) کہ ان کی تکمیل سے گریز ناممکن ہوگیا ہے، ان کی تاریخ اب "تاریخ اسلام" ہوگی، اُن کے کندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری آن پڑی ہے۔ اب خواہ وہ اُسے پسند کریں یا اس پر نادم ہوں، بہرحال وہ "اسلامی ریاست" کے تصور کو نظر انداز نہیں کر سکتے، اور نہ اسے زیادہ دیر سرد خانہ ہی کی نذر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت اسلامی ریاست کے نظریہ کو ختم کرنے کا فیصلہ محض طریق کار کی تبدیلی کا فیصلہ ہی نہیں ہو گا، یہ تو گویا اپنے دین اور وطن کی اساس پر کلہاڑا چلانے کے مترادف ہو گا۔ دنیا اس گریز سے یہی مطلب اخذ کرے گی کہ اسلامی ریاست کا نظریہ لایعنی اور اس کا نعرہ محض فریب نظر تھا جو حیات جدید کے تقاضوں سے نمٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، یا یہ کہ پاکستانی بحیثیت ایک قوم کے اُسے اپنی قومی زندگی پر نافذ کرنے میں ناکام رہے ہیں، اس صورت میں دنیا کے نزدیک خود مسلمانوں کے معتقدات ایمانی ہی مشکوک اور قابل تنقید ٹھہریں گے۔" (ISLAM IN MODERN HISTORY P. 209)

مولوی سیف اللہ نوری متعلم دارالعلوم حقانیہ

حسد اور اس کا علاج

جب انسان کسی کو مال، نعمت اولاد اور تندرستی میں اپنے سے اونچا دیکھتا ہے، تو اس کے دل میں دو باتیں پیدا ہوتی ہیں، یا تو یہ کہ وہ اسکی نعمت کا زوال چاہتا ہے جسکو حسد کہتے ہیں۔ یا یہ کہ زوال تو نہیں چاہتا مگر ویسی نعمتیں اپنے لئے بھی چاہتا ہے۔ اسکو غبطہ کہتے ہیں اور غبطہ حرام نہیں ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَاسْئَلُوا اللّٰہَ مِنْ فَضْلِہٖ ۔ اور مانگو اللہ سے اس کا فضل

غلط آرزوؤں کا دل میں رکھنا بھی خدا سے ناراضی اور ناشکری اور دنیا میں ہر وقت قلق و اضطراب کا باعث ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسا کوئی نہیں جسکی تمام آرزوئیں پوری ہوئی ہوں ——— بلکہ ——— ای بسا آرزو کہ خاک شدہ ——— اس لئے کسی عارف نے نفس کو اسی سلسلہ میں خدا سے ناراضگی کرتے دیکھ کر کہا ہے ۔

سرمد گلہ اختصار می باید کرد
یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید کرد
یا قطع نظر ز یار می باید کرد

حسد کرنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ چنانچہ اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ ط لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا ط وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ ط

اور ہوس مت کرو جس چیز میں بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر مردوں کو حصہ ہے اپنی کمائی سے اور عورتوں کو حصہ ہے اپنی کمائی سے۔

(شیخ الہند)

اور حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عزوجل کا ارشاد ہے :

اَلْحَاسِدُ عَدُوٌّ لِنِعْمَتِیْ وَمُتَسَخِّطٌ لِقَضَائِیْ غَیْرُ رَاضٍ بِقِسْمَتِیَ الَّتِیْ قَسَمْتُ بَیْنَ عِبَادِیْ۔	حسد کرنیوالا میری نعمت کا دشمن اور میری قضاء پر ناخوش، میری اس تقسیم سے ناراض ہے۔ جو میں نے اپنے بندوں میں کرچکا ہوں۔ (زواجر ص۴۶)

حسد کی برائیوں اور نقصانات کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

۱۔	الحسد یفسد الایمان کما یفسد الصبر العسل۔	حسد ایمان کو اس طرح بگاڑ دیتا ہے جیسے ایوا شہد کو بدمزہ کرتا ہے۔ (الدیلمی)
۲۔	ایاکم والحسد فان الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب۔ (ابوداؤد)	حسد سے بچو، حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ سوکھی لکڑیوں کو جلا دیتی ہے۔
۳۔	لیس منی ذو حسد ولا نمیمة ولا کہانة ولا انا منہ۔	حاسد، چغل خور، کاہن۔ یہ تینوں نہ میرے ہیں اور نہ میں ان کا ہوں۔ (زواجر)
۴۔	لایزال الناس بخیر ما لم یتحاسدوا۔	لوگ ہمیشہ بھلائی میں رہیں گے جب تک وہ باہمی حسد نہ کریں۔ (زواجر)
۵۔	ستة یدخلون النار قبل الحساب بسنة قیل من هم یارسول اللہ قال الامراء بالجور والعرب بالعصبیة والدهاقین بالتکبر والتجار بالخیانة واهل الرستاق بالجهالة والعلماء بالحسد۔ (زواجر)	چھ آدمی ایسے ہیں جو بدون حساب ایک سال پیشتر جہنم داخل کردئے جائیں گے۔ کسی نے دریافت کیا یارسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: امراء بسبب ظلم کے، اہل عرب بسبب عصبیت (قومی تفاخر) کے دہقان کا شکار بسبب تکبر کے، تجار بسبب خیانت کے۔ گاؤں کے لوگ بسبب جہالت کے۔ علماء بسبب حسد کے۔
۶۔	ان ابلیس یقول ابغوا من بنی آدم البغی والحسد فانهما یعدلان عند اللہ الشرک۔	شیطان اپنے ماتحت سے کہتا ہے کہ انسان کو ظلم اور حسد میں ڈالنے کی کوشش کرو کیونکہ یہ دونوں اللہ کے ہاں شرک کے برابر ہیں۔ (الزواجر عن اقتراف الکبائر ص۴۵)

۷۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ دو بھوکے بھیڑیئے اگر بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دئے جائیں تو وہ اسے اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتے جس قدر حرص اور حسد مسلمانوں کے دین کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ (دوزخ کا کھٹکا۔ ص")

ان مذکورہ احادیث سے بھی ثابت ہوا کہ حسد کرنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے ---- البتہ جو شخص اللہ کی دی ہوئی نعمت ظلم و معصیت میں خرچ کر رہا ہو۔ مثلاً مالدار ہو اور شراب خوری و زناکاری میں اڑا رہا ہو، ایسے شخص پر حسد کرنا اور اس کا مال چھن جانے کی آرزو کرنا گناہ نہیں ہے۔ کیونکہ درحقیقت مال کی نعمت چھن جانے کی تمنا نہیں ہے، بلکہ اس بیحیائی اور معصیت کے بند ہو جانے کی خواہش ہے۔

عموماً حسد کا سبب یا تو نخوت و غرور ہوتا ہے۔ یا عداوت و خباثت نفس، کہ بلا وجہ خدا کی نعمت میں بخل کرتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ جسطرح میں کسی کو کچھ نہیں دیتا ہوں۔ اسطرح حق تعالےٰ کسی کو کچھ نہ دے ---- شاید کسی کو یہ شبہ لاحق ہو کہ دوست اور دشمن میں فرق ہونا انسان کا طبعی امر ہے۔ اور اپنی اختیاری بات نہیں ہے کہ جسطرح دوست کو راحت میں دیکھ کر خوشی ہوتی ہے، اسی طرح دشمن کو بھی راحت میں دیکھ کر مسرت ہوا کرے۔ اور جب اختیاری بات نہیں ہے تو انسان اس کا مکلف بھی نہیں ہو سکتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک اتنی بات صحیح ہے اور اگر اس حد تک رہے تو کوئی گناہ بھی نہیں، لیکن اس کے ساتھ جتنی بات اختیاری ہے۔ اس سے بچنے کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور وہ دو امر ہیں، ایک یہ کہ اپنی زبان اور اعضاء اور افعال اختیاریہ میں حسد کا اثر مطلق نہ ہونے دو بلکہ نفس پر جبر کرکے اسکی ضد پر عمل کرو۔ دوم یہ کہ نفس میں جو حسد کا مادہ موجود ہے۔ جو اللہ کی نعمتوں کو بندوں پر دیکھنا پسند نہیں کرتا، اسکو دل سے مکروہ سمجھے اور یہ خیال کرے کہ یہ خواہش دین کو برباد کرنے والی ہے۔ ان دو باتوں کے بعد اگر طبعی امر باقی رہے، دل بے اختیار چاہے کہ دوست خوشحال ہو اور دشمن پامال، تو اس کا خیال نہ کریں۔ کیونکہ جب اس کے ازالہ پر ہی قدرت نہیں تو اس پر گناہ نہیں ہوگا۔ مگر دل کی ناگواری ضروری ہے اور اسکی علامت یہ ہے کہ اگر محسود کے نعمت زائل کرنے پر تم کو قدرت حاصل بھی ہو جائے اور اپنی طبیعت سے خواہش بھی، کہ کاش! اسکی نعمت چھن جائے، مگر خود ایسا انتظام نہ کرے۔ (اربعین)

حسد قلبی مرض ہے اور اسکا علاج دو قسم کا ہے۔ ایک علمی اور ایک عملی۔ علمی علاج یہ ہے

کہ حاسد کو جاننا چاہیئے کہ اس کا حسد اُسے نقصان پہنچا رہا ہے۔ اس محسود کا (جس کے ساتھ حسد کر رہا ہے) کچھ نہیں بگڑتا۔ بلکہ اُسے نفع ہے کہ حاسد کی نیکیاں مفت میں اس کے ہاتھ آ رہی ہیں۔ برخلاف حاسد کے کہ اس کے دین کا بھی نقصان ہے اور دنیا کا بھی۔ دین کا نقصان تو یہ ہے کہ اس کے کئے ہوئے نیک اعمال حبط ہوتے جا رہے ہیں اور وہ اللہ کے غصہ کا نشانہ بنا ہوا ہے، کیونکہ اللہ کے وسیع خزانہ کی بیشمار نعمتوں میں بخل کرتا ہے، اور دوسرے پر انعام ہونا پسند نہیں کرتا۔ اور دنیا کا نقصان یہ ہے کہ حاسد ہمیشہ رنج و غم میں مبتلا رہتا ہے۔ اور اسی فکر میں گھلتا رہتا ہے کہ کسی طرح فلاں شخص کو ذلت و افلاس نصیب ہو، حالانکہ جس پر حسد کیا جا رہا ہو اس کے لئے خوشی کا مقام ہوتا ہے کیونکہ اُسے حاسد کے حسد سے فائدہ پہنچتا ہے۔ اور حسد کرنے والا انحسار سے میں رہتا ہے۔

ذرا سوچیئے کہ حسد کرنے سے محسود کو کیا نقصان ہوا۔؟ ظاہر ہے کہ اسکی نعمت میں کسی قسم کی بھی کمی نہیں آئی، بلکہ اُسے مزید نفع ہوا کہ حاسد کی نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں درج ہو گئیں ___ اور اس کے برعکس حاسد نے عذاب آخرت بھی سر پہ اٹھایا اور قناعت و آرام کی زندگی چھوڑ کر ہر وقت کی خلش اور دنیوی کوفت خریدی یہ تو ایسی صورت ہوئی کہ حاسد جو پتھر دشمن کو مارنا چاہتا تھا وہ اُسے ہی آ لگا۔

حسد کا عملی علاج یہ ہے کہ نفس پر جبر کیا جائے اور قصداً اس کے منشاء کی مخالفت کر کے اسکی ضد پر عمل کیا جائے یعنی محسود کی تعریفیں بیان کی جائیں اور اس کے سامنے تواضع کی جائے اور اس نعمت پر خوشی و مسرت کا اظہار کیا جائے جو اُسے مرحمت ہوئی ہو۔ چند روز بتکلف ایسا کرنے سے حاسد کو محسود کے ساتھ محبت ہو جائے گی اور عداوت جاتی رہے گی اور حسد ختم ہو جائے گا۔ اور اس رنج و غم سے نجات مل جائے گی جو حسد کی وجہ سے مل رہا تھا۔

پچھلے دنوں مولانا احمد عبدالرحمان صدیقی فاضل حقانیہ ناظم اعلیٰ انجمن خدام الدین نوشہرہ کے والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم صالح، متدین بزرگ تھے۔ دارالعلوم حقانیہ اور ادارۂ الحق حضرت مرحوم کے رفع درجات کا متمنی ہے۔ خداوند کریم مرحوم کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرماوے۔ آمین (ادارہ)

الحق

حضرت مولانا قاضی عبدالصمد سربازی فاضل مدرسۂ عربیہ امینیہ دہلی، قاضی القضاۃ محکمۂ شرعیہ قلات ڈویژن

با شہامت جلوہ افروز است "الحق" ماہوار
از شکوہش ہر رگِ باطل بگشتہ تارتار

نورش درخشندہ است چوں خورشید تابانِ جہاں
ضوء افشاں است در ہر گوشہ و کنج و کنار

کشتِ دلہا را کند سرسبز و تازہ و سبز دم
در اثر چوں ابرِ نیساں است دیا ابرِ بہار

جملہ مضمونش بخوبی دل پسند و دلربا
دل ہمی خواہد کہ خواند ہر یکے را بار بار

ہست پیغامِ حیات او سو بسو در کو بکو
بہرِ باطل قاصدِ موت است ہمچوں زہر مار

سرپرستش بانیٔ دار العلوم آں دیار
شیخ "عبدالحق" آں شیخ الحدیث نامدار

مطلعش یک خطۂ معروف در ارضِ خٹک[1]
مرکزش "حقانیہ"[2] سرچشمہ اش در کوہسار

از "سمیع الحق" بشنو نکتہائے صدق و حق
کو مدیرِ "الحق" است آں حق پرست و حق نگار

شانِ حق یَعلُو وَلَا یُعلیٰ بتائیدِ اللہ
ہست باطل پست و مردود و ذلیل و نابکار

حق بمیداں چوں در آید نور افشاں در جہاں
ظلمتِ باطل کند راہِ ہزیمت اختیار

۱؎ اکوڑہ خٹک
۲؎ دارالعلوم حقانیہ

حق و باطل را بہ ہنگامے کہ باشد معرکہ
روح باطل می پرد از تن بوقت کارزار

اصل حق ثابت بود تا آسمانہا فرع او
اصل برف زعش تا بروز حشر باشد برقرار

از اہل حق چوں نعرۂ تکبیر می گردد بلند
لات و عُزّیٰ سرنگوں افتادہ باشد خوار و زار

نصرتِ حق شامل احوال مرد حق بُوَد
از حکایاتِ سلف بینی مثالِ بے شمار

ہست سربازی یکے از خادمانِ دینِ حق
دارد امیدِ قوی از رحمتِ پروردگار

تردید ارتداد

جناب خواجہ محمد علیم صاحب الحسنی [illegible]

قرآن ہدایت ہے اک زندہ صداقت ہے
جو منکرِ قرآن ہے محروم بصارت ہے

اغیار کی عینک سے قرآن کو پڑھتے ہو
پھر زعمِ ہمہ دانی واللہ جہالت ہے

اصلاح کے پردے میں بے دینی و زندیقی
یہ کیسی شقاوت ہے یہ کیسی ضلالت ہے

کہتے ہیں بدل ڈالیں احکام الٰہی کو
ارشاد لحافظون قرآن کی حفاظت ہے

منکر ہو نبوت کے اقوال رسالت کے
یہ کون سی حکمت ہے یہ کیسی فراست ہے

مومن کو نہیں خطرہ بے دین کی شرارت سے
گمراہ کو مہلت دے اللہ کی عادت ہے

کہہ دو یہ علیم اب تم ہاتف کی ندا ہے یہ
قرآن کی صداقت پر قرآن خود حجت ہے

تعارف و تبصرہ

ختم نبوت کامل

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ صدر دارالعلوم کراچی

پتہ :- ادارۃ المعارف کراچی ۱۴؎ ۔ ضخامت ۲۹۴ ۔ قیمت مجلد بارہ روپے ۔

عقیدۂ ختم نبوت اساسِ ایمان ہے ۔ اور اس عقیدہ سے انکار یا اس میں تحریف و تاویل باتفاق امت کفر و ارتداد ہے ۔ اس بنا پر ابتدائے اسلام سے لیکر آج تک جمہور امت نے نہ تو کسی مدعی نبوت کو مسلمان سمجھا ہے اور نہ اس کے کسی ماننے والے کو مسلمانوں کے زمرہ میں شامل کیا گیا ہے ۔ امت مسلمہ کے ہاں یہ ایک ایسا اجماعی مسئلہ ہے کہ قیامت تک اسے نہیں توڑا جا سکتا ، اگر کوئی فرد یا جماعت خواہ اس کا تعلق عوام سے ہو یا اقتدار سے اس عقیدہ کو مجروح کرنے کی کوشش کرتی ہے تو سوائے اس کے کہ وہ دنیا اور آخرت کی ذلت اور رسوائی مول لیتی ہے ، مسلمانوں کے اس عقیدہ کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتی ، یہ تاریخ کا اٹل فیصلہ ہے ۔ ختم نبوت کا یہ عقیدہ اٹوٹ ہے اور قیامت تک رہے گا ۔ اور قصر نبوت ، دجالین و کذابین اور ان کے اعوان و انصار ایمان و یقین سے عاری منافقوں کے علی الرغم تا قیامت قائم اور محفوظ رہے گا ۔ متحدہ ہندوستان میں مرزائے قادیان نے دعوائے نبوت کیا ، ختم نبوت کے معانی اور مفہوم میں تحریف و تلبیس کی ، وہ قصرِ نبوت میں (بفاکم بدہن) نقب لگانے والے تمام لٹیروں میں سب سے بڑھ کر بے حیا بے شرم عیار اور اخلاق و کردار سے تہی ، ابلیسانہ مکاریوں کا مجسمہ سراپا دجل و تلبیس تھا ۔ مسلمانوں نے اتنے ہی زور شور سے اور یک آواز ہو کر اسے کافر ، مرتد اور خارج از اسلام قرار دیا ، برصغیر کے اجلہ علماء ناموسِ رسالت کی حفاظت کے جذبہ سے سرشار ہو کر تدریس و تصنیف ، علم و تحقیق ، مناظرہ اور مباحثہ کے ذریعہ اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے کود پڑے ۔ دارالعلوم دیوبند جس کے سر پہ خدا نے عظمتِ اسلام کی حفاظت کا سہرا رکھا تھا اور جو محمدی امانتوں کا نقیب امین تھا ، اس کے اکابر نے اس فتنۂ طاغیہ کا اسی انداز سے تعاقب کیا جو دارالعلوم کی تابناک تاریخ دعوت و عزیمت کا تقاضا ، اور اس کی روایات کے شایانِ شان تھا ۔ ان ہی اکابر میں فقیہ وقت ، مفتی عصر مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی مدظلہٗ کا نام نامی بھی ہے جنہوں نے اپنے شیخ حضرت علامہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی خواہش پر عقیدۂ ختم نبوت کے اثبات اور تشریح پر قرآن و حدیث اور آثارِ صحابہ و تابعین کی روشنی میں "ختم نبوت" کے نام سے نہایت محققانہ اور

فاضلانہ کتاب لکھی۔ پروفیسر الیاس برنی مرحوم کی کتاب اگر قادیانی خرافات اور دعاوی باطلہ کی جامع ہے تو حضرت مفتی صاحب کی کتاب بلاشبہ دلائل ختم نبوت اور اس کے متعلقہ مباحث کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ حضرت مصنف مدظلہٗ نے نبی اور رسول کی صحیح تعریف اور مرزائے قادیان کے تحریفات سے بحث کرنے کے بعد تقریباً ایک سو آیات قرآنی دوسو احادیث نبوی اور صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین وعلمائے اسلام کے سینکڑوں اقوال سے ختم نبوت کی ضرورت، اہمیت اور اس کا اساس ایمان ہونا ثابت فرمایا ہے۔ اپنے مذموم مقصد کے لئے قادیانیوں نے ابن عربیؒ، شاہ ولی اللہ، مولانا محمد قاسمؒ اور بعض دیگر اکابر فقہ وتصوف کی عبارتوں کو توڑ موڑ کر جس شاطرانہ طریقہ سے اپنی مقصد برآری کرنا چاہی ہے۔ حضرت مفتی اعظم نے اس کتاب میں اس کا بھی محاسبہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ عقیدۂ ختم نبوت ان تمام اکابر کا عقیدہ ہے اور امت کے یہ تمام اکابر کسی نئی نبوت کے ماننے والے کو کافر، مرتد اور واجب القتل سمجھتے ہیں مؤلف کتاب کو اللہ تعالیٰ نے خداداد بصیرت، تبحر علمی، فقاہت اور وسعت معلومات کے ساتھ ساتھ تقویٰ اور اتباع سلف کے جذبات سے بھی نوازا ہے، اور دلنشین، عام فہم انداز بیان سے بھی۔ پھر کتاب کے اس چوتھے ایڈیشن میں تو خاص طور سے مناظرانہ عنوان چھوڑ کر ناصحانہ عنوان اختیار کیا گیا ہے، تاکہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے اگر کوئی شخص اس فتنۂ ضالہ کے دجل وفریب میں آچکا ہو تو یہ کتاب اس کے لئے بھی ذریعۂ ہدایت بن سکے۔ ناشر کتاب ادارۃ المعارف شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے اس وقیع کتاب کو کتابت و طباعت کی پوری خوبیوں کے ساتھ نئے انداز میں شائع فرمایا۔ کتاب مدت ہوئی کہ ملک کے تمام علمی و دینی حلقوں سے خراج تحسین پاچکی ہے۔ اس بنا نفس کتاب کی خوبی، افادیت کے بارہ میں کچھ کہنا مارح خورشید کا مصداق بننا ہے۔ تمام مسلمانوں بالخصوص اہل علم، طلباء و اساتذۂ مدارس عربیہ کو اس موضوع سے کما حقہٗ باخبر ہونے کیلئے اس کا مطالعہ لازمی ہے۔ (س ح)

انڈکس قرآنی یعنی فہرست احکام قرآنی

از جناب سید معصوم علی صاحب سبزواری

ناشر ادارۂ تعلیم النسانیت ۱۲۵/۵ مسجد روڈ بہار کالونی کراچی ۲

ضخامت ۲۰۰، کاغذ سپر کلنڈر، کتابت وطباعت آفسٹ۔ قیمت مع محصولڈاک دس روپے۔

معاونین وخواص جو بھی عطا فرمادیں۔

نزول قرآن سے لیکر اب تک قرآن مجید کے مختلف گوشوں پر نہایت وقیع اور عالمانہ

خدمات انجام دی جا رہی ہیں، کیا یہ اس کے اعجاز کا ایک کھلا ثبوت نہیں کہ نہ تو اس کے عجائب ختم ہوئے اور نہ خدمت کرنے والوں کے جوش ولولہ اور حوصلہ مندی میں کوئی فرق آیا۔ اس عزم جواں اور حوصلہ بلند کا ایک جیتا جاگتا نمونہ اس کتاب کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ قرآن کریم کے مضامین، آیات اور احکام وغیرہ پر مختلف النوع فہرستیں مسلمانوں اور غیر مسلم فضلاء نے تیار کی ہیں مگر قرآنی انڈکس کے مؤلف نے مضامین اور مشمولات قرآن کا انڈکس جس نئی شان بان اور طویل الذیل منصوبہ سے شروع فرمایا ہے وہ کسی پورے ادارہ یا کسی بڑی جماعت مصنفین کے کرنے کا کام تھا مگر ہمارے مؤلف نہ صرف اکیلے یہ کام انجام دے رہے ہیں بلکہ عمر کی اس حد (۸۹ برس) میں ہیں جہاں پہنچ کر فکری وعملی توانئیں جواب دے جاتی ہیں۔ حدیث میں ہے کہ بڑھاپے کے ساتھ حرص اور لمبی لمبی آرزوئیں بڑھتی جاتی ہیں۔ یہ طبعی چیزیں جب دین کی راہ میں لگ جائیں تو دین کے کیسے کیسے کام ضعیف اور ناتواں قویٰ سے کروا دیتی ہیں، مؤلف کی ہمت اور عزائم کا عجیب عالم ہے۔ قرآنی انڈکس (اشاریہ) کا یہ کام انشاء اللہ ۲۱ جلدوں میں پورا ہوگا جب کہ مسودہ مکمل ہو چکا ہے اور نظر ثانی باقی ہے۔ پھر بعض جلدوں میں بہ اعتبار ابواب وضخامت کے کچھ حصص اور اجزا بھی ہوں گے اور اسطرح فہرست قرآن کریم کی کل ۵۳ جلدیں ہونگی زیر نظر کتاب اس سلسلہ کی پہلی کتاب یعنی کتاب الاخلاق ہے جسے مصنف نے تین ابواب پر تقسیم کیا ہے۔ اخلاق حسنہ حصہ اول و دوم، اخلاق سیئہ، اخلاق متفرقہ پیش نظر ضخیم جلد صرف اخلاق حسنہ کا حصہ اول ہے۔ پہلے حروف تہجی کی ترتیب پر عنوان قائم کئے گئے ہیں۔ پھر اس فوقی عنوان کے تحت اصل آیت یا آیات کے موضوعات کا قدرے تفصیلی تجزیہ کر کے آیت قرآنی کا بامحاورہ اردو ترجمہ پھر جہاں ضرورت سمجھی گئی بعض مروجہ اردو تفاسیر سے تشریحی نوٹ دئے گئے ہیں۔ اگرچہ کسی عالم یا مفسر کی ثقاہت پر مسلمانوں کے سارے فرقے متفق نہیں ہو سکتے تاہم مصنف اگر بعض ایسے حضرات کا تفسیری نوٹوں کے لئے انتخاب نہ کرتے جن سے مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ مکاتب فکر کا اختلاف ہے تو یہ چیز کتاب کی افادیت کیلئے بہت مناسب تھی۔ خطرہ ہے کہ اس قسم کی نزاعی شخصیت کی وجہ سے اتنی عظیم خدمت سے بعض طبقے استفادہ نہ کر سکیں۔ اس طرح اخلاق حسنہ کے متعلق فہرست میں بعض ایسے عنوانات بھی نظر آتے ہیں جن کا بظاہر اخلاق سے تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً آخرت حشر وغیرہ (ص ۱۳۱) اطمینان قلب (ص ۲۳۳) القاء (ص ۲۷۲) الہام (ص ۲۹۶) ایجادات و اختراعات (ص ۲۵۵)۔ فہرست میں اخلاق کا مفہوم اتنا وسیع قرار

دینے کی بجائے ایسے امور کو اپنے واضح عنوان کا اعتقادات، تصوف وتزکیۂ نفس، آیات تکوینی وغیرہ کے ذیل میں لانا چاہئے تھا۔ تاکہ موضوع ومضمون کے انتخاب کی کوئی واضح اور آسان صورت سامنے ہوتی، اس طرح ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کے ذہن میں مطلوبہ موضوع کا کوئی اور نام ہو اور مصنف نے اسے دوسرا نام دیکر کسی دوسرے باب میں شامل کیا ہو اور تلاش کے باوجود نہ مل سکے گا۔ مثلاً کسی کو ناپ تول کے بارہ میں قرآنی حکم کی تلاش ہو اور اس کے ذہن میں مصنف کا تجویز کردہ عنوان "پورا تولنا" نہ ہو تو اسے حرف "پ" کے تحت کیسے تلاش کرے گا۔ خدا کرے مؤلف انتخاب وتلاش کی کوئی زیادہ واضح اور منقح صورت اختیار کرلیں۔ نیز کتاب کے جلد کے آغاز میں جدید عربی یا انگلش ڈکشنریوں اور فہرستوں کی طرح انتخاب موضوع کی نہایت واضح ہدایات مختصر سے مختصر الفاظ میں دینی چاہئیں۔ اسی طرح ایک اور چیز جو عربی سے معرّیٰ "اردو قرآن اور نماز" کی تحریک کی وجہ سے طبیعت کو بہت کھٹکتی رہی ہے وہ آیات قرآنی کے اردو ترجمہ پر اکتفا کرنا ہے۔ اس سے قطع نظر دیسے بھی قرآن مجید کے مضامین کا پھیلاؤ مؤلف کی خدمات کا صحیح اندازہ اور اس سے پورا استفادہ تب ہو سکے گا کہ آیات قرآنی نگاہوں کے سامنے ہیں، اس مصروف ترین دور میں آیات وسور کے نمبرات سے یہ کمی پوری نہیں ہو سکتی۔ ضروری کیا بلکہ لازمی ہے کہ اگلی جلدوں میں اسکی تلافی ہو جائے۔ بہرتقدیر مؤلف کی اس خدمت کو دیکھ کر دل قرآن کی عظمتوں میں ڈوب جاتا ہے کہ یہ آسمانی کتاب اس مادیت زدہ دور میں بھی کیسے کیسے کرشمے دکھاتی ہے۔ مؤلف کو خداوند کریم اس کتاب کی تکمیل کی توفیق دے اور اس کے ساتھ اس کتاب کو پیرایۂ طباعت میں دیکھنے کا موقع بھی کہ دنیا میں بھی اس محنت سے انکی آنکھیں ٹھنڈی ہو سکیں، اصل بدلہ اور نتائج تو آخرت کے ہیں، جس کا مؤلف نے انشاء اللہ بڑا سامان کر دیا ہے۔ (س)